"URDU SAFAR NAMOUN KE FAROOGH MEIN KHAWATEEN KA HISSA-2000 KE BAAD"

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement of the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

IN URDU

Submitted

By

PESHIMAM BAHADDUR HUSSAIN

Reg.No:17HUHL18

Under the Supervision
Of
Dr. **NISHATH AHMED**

Department of Urdu, School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad 500 046

JUNE 2019

اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ

2000ء کے بعد

(تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل، اردو)

مقالہ نگار:

پیش امام بہادر حسین

ریسرچ اسکالر: یونی ورسٹی آف

حیدرآباد

نگراں:

ڈاکٹر نشاط احمد

اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد، تلنگانہ 500046

جون 2019

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

DECLARATION

I, **PESHIMAM BAHADDUR HUSSAIN**, hereby declare that this dissertation entitled **"URDU SAFAR NAMOUN KE FAROOGH MEIN KHAWATEEN KA HISSA-2000 KE BAAD"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr. NISHATH AHMED**, is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other Institutions for award of any degree or diploma.

I hereby agree that my dissertation can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Name: **PESHIMAM BAHADDUR HUSSAIN**

Signature of the Student

Regd. No: 17HUHL18

CERTIFICATE

This is to certify that the Dissertation entitled **"URDU SAFAR NAMOUN KE FAROOGH MEIN KHAWATEEN KA HISSA-2000 KE BAAD"** submitted by **PESHIMAM BAHADDUR HUSSAIN** bearing registration number **17HUHL18** in partial fulfillment of the requirement for the award of degree of **Master of Philosophy** in **Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This Dissertation has not been submitted previously in part or full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

He has presented an article in the following conference ''IQBAL AUR BACHON KA ADAB'' presented in two days National Multilingual Seminar on 23rd &24th February, 2019. {Copy of the certificate is closed}

Signature of the Supervisor

Countersignature

Head of the Department

Dean
School of Humanities

فہرست

پیش لفظ		1تا3
پہلا باب	اردو میں سفرنامہ	4
	اردو سفرنامے کی تعریف	5
	اقسام سفر	9
	سفر اور سیاحت میں فرق	11
	سفر کی ضروریات	12
	سفر کی اہمیت اور افادیت	14
	سفرنامے کا فن	15
	قدیم وجدید سفرناموں کے مابین فرق	24
	سفرنامے کے موضوعات اور اسالیب	28
	سفرنامے کے حدود وامکانات	29
دوسرا باب	اردو سفرنامے کا آغاز وارتقا	36
	سفرنامے کی ابتدا	37
	اردو سفرنامے کی ابتدا اور ارتقا	41
	انیسویں صدی کے اہم سفرنامے	48
	بیسویں صدی کے نصف اول کے اردو سفرنامے	57

	آزادی کے بعد سے عصر حاضر تک اردو سفر نامے	63
تیسرا باب	**اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ 2000ء کے بعد**	69
	اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کی حصہ داری	70
	2000ء کے بعد خواتین سفرنامہ نگار	71
	لالی چودھری	71
	سفرنامہ ''دلّی ایک شہر آرزو''	73
	سفرنامہ ''خیاباں خیاباں اِرم''	83
	سفرنامہ ''جنیوا شہر امن یا شہر جیب تراشاں''	95
	سفرنامہ ''کاخ وکوئے طلیطلہ''	100
	اے امیر النساء	116
	سفرنامہ ''سرحد کے اس پار''	117
	نیلوفر ناز نحوی قادری	126
	سفرنامۂ حج ''شہرہائے نور''	127
اختتامیہ		139 تا 149
کتابیات		150 تا 151

پیش لفظ

اللہ جل وشانہٗ کے کرم اوراس کے محبوب کریم ﷺ کے لطف عمیم سے میرا مقالہ پائے تکمیل تک پہنچا۔

تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔اپنی فکشن سے دلچسپی کے باوجود بھی میں کشمکش کی گھڑیوں سے دوچار ہورہا تھامگر میرے نگراں ڈاکٹر نشاط احمد صاحب نے میری پریشانی کوابر باراں کی مانند حل کردیااور میرے مقالے کا موضوع ''اردوسفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ 2000ء کے بعد'' منتخب کیا۔

مقالے کی تیاری اور مواد کی فراہمی یقیناًایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔لیکن میرے نگراں واساتذہ کی رہنمائی و رہبری نے میرے کام کوآسان بنادیا جنھوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازاتے ہوئے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

زیرنظر مقالہ تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

پہلا باب: **اردو میں سفرنامہ** کے عنوان سے ہے۔جس میں اردوسفرنامے کی تعریف،اقسام سفر،سفراورسیاحت میں فرق،سفرکی ضروریات،سفرکی اہمیت اورافادیت،سفرنامے کافن،قدیم وجدید سفرناموں کے مابین فرق،سفرنامے کےموضوعات اوراسالیب،سفرنامے کےحدودوامکانات پرتفصیلی بحث کی گئی ہے۔

دوسراباب: **اردوسفرنامے کا آغازوارتقا** ہے۔جس میں سفرنامے کی ابتدا،اردوسفرنامے کی ابتدا اورارتقا،انیسویں صدی کے اہم سفرنامے،بیسویں صدی کے نصف اول کے اردوسفرنامے،آزادی کے بعد سے عصر حاضرتک اردوسفرنامے کی روایت کوپیش کیا گیا ہے۔

تیسراباب: **اردوسفرناموں کےفروغ میں خواتین کا حصہ 2000ء کے بعد**

کے نام سے ہے۔جس میں اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کی حصہ داری کی روایت کو پیش کر کے 2000ء کے بعد کی خواتین سفرنامہ نگاروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ نیز منتخبہ تین سفرنامہ نویس جس میں لالی چودھری کے چار سفرنامے ''دلّی ایک شہرِ آرزو''، ''خیاباں خیاباں اِرم''، ''جنیوا شہرِ امن یا شہرِ جیب تراشاں''، ''کاخ و کوئے طلیطلہ''، اے امیر النساء کا ایک سفرنامہ ''سرحد کے اس پار'' اور نیلوفر ناز نحوی قادری کا ایک سفرنامۂ حج ''شہر ہائے نور'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

اختتامیہ: میرے مقالے کا آخری حصہ اختتامیہ ہے جس میں مقالے کے تمام ابواب کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے، آخر میں کتابیات درج کی گئی ہیں۔

میں اپنے نگراں ڈاکٹر نشاط احمد صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنھوں نے میری ہر طرح سے مدد فرما کر مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی وحوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے شعبۂ اردو کے صدر محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب اور شعبے کے دیگر تمام اساتذۂ کرام کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے تحقیقی سفر کے رموز واسرار سے روشناس کرایا۔

میں اپنے والدین ماجدین کا صمیم قلب سے متشکر ہوں جنھوں نے مجھے گھر کی ذمہ داریوں سے فارغ البال رکھا اور اپنی سحر گائی دعاؤں سے نوازتے ہوئے میرے تعلیمی سفر کی ہر غیر ممکنہ صورت حال میں کوہِ گراں بن کر ہمیشہ کامیابی کے لیے کوشاں رہے۔ میں اپنے والد مرحوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ان کو بہشت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے جن کی دیرینہ خواہشوں کی بدولت میں اس مقام تک آ پہنچا۔

میں اپنے بڑے ابا، چچا، بھائیوں، بہنوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت اور منزل مقصود تک پہنچنے کی دعا کے لیے اپنے ہاتھوں کو ہمیشہ دراز رکھا اور میری ہر قدم پر رہبری و حوصلہ افزائی فرمائی۔

میں اپنے محبّ گرامی سید عارف پاشا صاحب اور آپ کے والد بزرگوار کا بے حد شکر گزار ہوں جن کے مفید مشوروں اور رہنمائی کی بدولت میرا تعلیمی سفر تحقیق کی منزل تک پروان چڑھا۔

اخیر میں شعبۂ اردو کے تمام ریسرچ اسکالرز و جملہ احباب خصوصاً محمد نسیم امانتی، راج محمد، گلزار، محمد الیاس، سجاتا، ارشد مرکزی، عبدالعظیم، شاہنواز، محمد نور احمد نور، شیخ مستان ولی، اظہر بھائی، پرمیش راجو، نفیس کا بے حد متشکر ہوں جو میرے مقالے کی تیاری میں ہمیشہ معاون بن کر شریک سفر رہے۔

اللہ جل شانہٗ انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی اور سلامتی عطا فرمائے۔ آمین

راقم الحروف

پیش امام بہادر حسین

ریسرچ اسکالر

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

جون، 2019

MH-C، روم نمبر 402

نارتھ کیمپس

حیدرآباد

پہلا باب

اردو میں سفرنامہ

سفرنامے کی تعریف

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایک ہی ماحول ایک ہی جگہ اور ایک ہی طرح کہ لوگوں کے ساتھ تنگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جب انسان یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے تو وہ آمادۂ سفر کرتا ہے۔ کیوں کہ تبدیلی انسان کی فطرت ہے اور یہی فطرت اُسے نئے نئے مقامات کی سیر کراتی ہے۔ وہ اپنی بے زاری اور اُکتاہٹ پر قابو پانے کے لیے ارادۂ سفر کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو سفر ہی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ واپس آکر سفر کی روداد لکھ سکیں۔ لیکن اس بات میں کتنی صداقت ہے اسے جاننے کے لیے ہمیں مختلف سفرناموں کا اور سفر کے وجوہات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ نئے نئے ملکوں کی تاریخ وجغرافیہ اور اقوام عالم کے اخلاق و عادات، رسم ورواج، سوچ بچار اور تہذیب وثقافت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی انسان کو سفر کی جانب مائل کرتی ہے۔ لیکن جو لوگ سفر نہیں کر سکتے وہ ان سفرناموں کو پڑھ کر ذوقِ تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔

انسان کو جب اجنبی فضا اور ان دیکھے مناظر ایک نئے طرزِ فکر کی اساس فراہم کرتے ہیں۔ فضا اور ماحول کی اجنبیت اسے سفرنامے میں تجسس اور تحیر خیزی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور یہی عنصر افراد کو متحرک کرتی ہے، ان کے دلوں کو گرماتی ہے اور حوصلوں کو بلند کرتی ہے۔ یہاں تک کہ نئی جگہ کو دیکھنے کا شوق انھیں گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سفرناموں سے انسان کے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ انسان کو انسان کے بارے میں جغرافیائی حدوود کے بارے میں سماجیات کے بارے میں معاشی حالات کے بارے میں اور دوسرے قوموں کے رہن سہن کے بارے میں جانکاری فراہم ہوتی ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں انسان کو گھر سے باہر نکلنے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ تو اس کے دل میں سفر کا احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ مواقع کی یہ کمی اقتصادی دیگر مجبوریوں کے سبب بھی ہو سکتی ہے اور تہذیبی اور نظریاتی حد بندیوں کی وجہ سے بھی بہت سی دیوارین کھڑی ہو جاتی ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو معاشرے کے حصار

میں رہنے والے افراد کے لیے دور دیشوں کے قصے داستانوں سے زیادہ پُر لطف محسوس ہوتے ہیں۔ ہماری داستانوں میں بھی اکثر ان مقامات کے نام آتے ہیں۔ جہاں تک سفر کرنا اس وقت کے عام انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ پرانے زمانے میں سفر کو سقر کے نام سے جانتے تھے۔ وہ اس لیے کہ سفر پُر خطر ہوتا تھا اور جب کبھی انسان اگر سفر کرتے بھی تھے تو کاروانوں میں سفر کرتے تھے۔ اس زمانے میں انسانوں کی رسائی دوسرے قوموں کے ساتھ آسان نہ تھی اسی لیے داستانوں اور کہانیوں میں نئے نئے مقامات اور ملکوں کے بارے میں جاننا بہت پسند کرتے تھے۔ اہلِ مشرق کے لیے یورپ میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی۔ محدود وسائل کی وجہ سے مغرب کا سفر صرف تصور کی بزم ہی آراستہ کر سکتا تھا۔ بعد میں جب کچھ لوگ مغرب کے لیے رزمِ سفر ہوئے اور یورپ پہنچے تو ان کی آنکھیں حیرت واستعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہاں انھوں نے زندگی کو بالکل مختلف انداز میں دیکھا مغرب انھیں اپنے تصور کی ساری بلند پروازی اور خیال آفرینی سے بہتر اور بلند نظر آیا۔ اردو میں یوسف خان کمبل پوش کا پہلا سفر نامہ ''عجائباتِ فرنگ'' ایک مشرقی انسان کی تحیر خیزی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ سفر نامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک پُر کشش بیانیہ صنف ادب ہے۔ جسے سفر نامہ نگار کا طرزِ نگارش مزید پُر کشش بنا دیتا ہے۔

سفر عربی زبان میں مسافت طے کرنے یا مسافت قطع کرنے کو کہا جاتا ہے۔ انسان جب نقل مکانی کرتا ہے تو اس عمل سے گزرتا ہے اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ عمل خاصا دشوار گزار دور بعض حالات میں جان و مال کو خطرات میں ڈالنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب نے مسافر کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا ہے اور مسافر کو مختلف رعایتوں سے نوازا ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو مسافر کے ساتھ اچھے اخلاق، تواضع اور حسن سلوک کی تلقین کی ہے۔ اسلام نے مختلف معاملات مین مسافر کی مدد کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ صوم وصلوٰۃ جیسے فرائض میں بھی مسافر کے لیے نرمی برتی گئی ہے۔ اسلام نے سفر کو کامیابی کی کنجی قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں ''سِیْــرُوْ فِــیْ الْاَرْضِ '' کے ذریعے انسان کے عزم سفر کی زبردست حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے سفر اولیں سے نبی آخر الزماں کے سفرِ ہجرت تک بہت

سے پیغمبروں نے اپنے مبارک اسفار کو حصول مقصد اور تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا۔قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیائے کرام کے حالاتِ سفر موجود ہیں۔حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کے حکم سے کشتی میں سفر کیا اور جب دنیا کی تمام آبادی پانی کے سیل عظیم میں غرق ہوگئی، حضرت نوح علیہ السلام اور خدا کی طرف سے ان کی پناہ میں دی جانے والی جانیں محفوظ رہیں۔یہ طویل سفر حضرت نوح علیہ السلام کی کامیابی اور کامرانی کا وسیلہ ثابت ہوا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی سفر کرنا پڑا۔ان کی والدہ ماجدہ نے ظالم فرعون کے خوف سے اپنے جگر گوشے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریائے نیل میں بہادیا اور خدا کی امانت خدا کی حفاظت میں دے دی۔خدا نے اپنے پیغمبر کو ان کے جانی دشمن فرعون کے گھر میں پالنے کا بندوبست کیا۔یہ سفر ایسا رحمت والا تھا کہ اس نے فرعون کے غرور کو غرقِ آب کر دیا اور اس کی فرعونیت سے دنیا کو نجات دلائی۔حضرت یوسف علیہ السلام نے کنعان کے کنویں سے مصر کے بازار اور جیل تک کا سفر کیا اور اپنے سوتیلے بھائیوں کی مکاری اور سنگ دلی کے باعث تکلیفیں اُٹھا کر ذاتی مقاصد کی خودغرضانہ تکمیل کے لیے کی جانے والی انسانی شقاوت سے عالم کو روشناس کرایا۔برادرانِ یوسف کا یہ شرمناک عمل اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ حسد کی آگ انسانی دل و دماغ پر کتنا منفی اثر ڈال سکتی ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خشکی کا سفر اختیار کیا اور ایک لق و دق صحرائے بے کنار میں اللہ تعالیٰ کا گھر ''خانۂ کعبہ'' تعمیر کیا۔اللہ تعالیٰ کے گھر کو انھوں نے فطرت کی آنکھ مچولی سے پہچانا تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سفر آج تک جاری وساری ہے۔اللہ تعالیٰ کا گھر تمام بنی نوع انسان کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور اتحاد و اتفاق کا مرکز و محور ہے۔لاکھوں تشنگانِ حق دور دراز کا سفر کرتے ہوئے سال بہ سال یہاں پہنچتے ہیں اور نور ایمان کی دولت لے کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ ان کے گھر ایمان کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔حضور اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں کئی سفر اختیار فرمائے۔آپ ﷺ کا ہر سفر مبارک اور مثالی تھا۔حضور اکرم ﷺ کا اولین سفر تجارتی اغراض سے وابستہ تھا۔آپ ﷺ کو اس میں بھی وہ کامیابی حاصل ہوئی جو دوسرے تاجروں کے لیے باعث رشک تھی۔حضور ﷺ نے اپنی

محنت، دیانتداری، حق گوئی اور خدمت وایثار کے ذریعے نہ صرف اچھا منافع حاصل کیا بلکہ لوگوں کے دل بھی جیت لیے۔ اس سفر کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ حضور اکرم ﷺ کا سفر مدینہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ جس کے نتیجہ میں آنحضرت ﷺ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ معظّمہ واپس تشریف لائے۔ مدینہ منورہ کی ہجرت انسانی تاریخ کا وہ سنگ میل ہے جو بنی نوع انسان کی رہبری کے لیے مشعل جاوداں بن گیا ہے۔ ان تمام ظاہری اسفار کے علاوہ ایک روحانی سفر بھی ہے جو واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس غیر معمولی سفر میں حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات آسمانوں کی سیر کرتی ہے، اور کائنات کی تمام حد بندیوں کو عبور کرتی ہوئی خالق کائنات سے محو گفتگو ہوتی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک ایسا سفر ہے جس کی کوئی نظیر ممکن نہیں۔ اس سفر میں حضور والا صفات کی ذات اقدس تاریخ وجغرافیہ اور زمان ومکان کے تمام مناظر ومظاہر سے ماورا ہو جاتی ہے۔ اور اس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں جبریل امیں جیسے مقرب فرشتے بھی معذور و بے بس نظر آتے ہیں۔

مذاہب عالم کی سفر پسندی کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سفر ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو جسمانی اور دماغی اعتبار سے متحرک و بیدار رکھتا ہے اور انسان جسمانی و دماغی اعتبار سے بیدار وصحت مند رہ کر ہی مکمل انسان بن سکتا ہے۔ سفر انسان کو تساہل پسندی، تنگ نظری اور تنگ دلی جیسی خرابیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ سفر ان گنت کامیابیوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ ہے۔ سفر تجربے کی وسعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سیر وسیاحت میں نئے نئے اشخاص سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان کی خوبیاں دیکھ کر اپنی خامیوں پر نظر پڑتی ہے۔ عظیم شخصیتوں اور مشہور ومعروف لوگوں سے ملاقات کرنے اور فیض حاصل کرنے کے مواقع ملتے ہیں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے اور انسانی تعمیر وترقی کے کارناموں سے واقف ہونے کے لیے بھی سفر سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں۔

لندن کے سفر میں سرسید احمد خان کو انگرزون کی تعلیم وتربیت اور تہذیب وتمدن نے ایسا متاثر کیا کہ انھوں نے اسی طرز پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جس کے نتیجے میں آج علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ گھر میں بیٹھے ہوئے انسان کو کوئی

چیز حاصل نہیں ہوتی۔ زندگی کی معمولی سی معمولی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آدمی کو گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے چاہے وہ تھوڑی دیر کے لیے کیوں نہ ہو یا چاہے وہ تھوڑی دور کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اس طرح بڑے مقاصد کی تکمیل کے لیے سفر کی ضرورت اور اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم اپنی تہذیب اور اپنے تمدن یا اپنی کسی بھی قومی یا انفرادی خصوصیت کو پرکھنا چاہتے ہیں کسی دوسری تہذیب اور کسی دوسری خصوصیت کو سامنے رکھ کر ہی پرکھتے ہیں۔ اسی لیے سفر کو ''وسیلۂ ظفر'' کہا گیا ہے۔ تحسین فراقی ''عجائبات فرنگ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک سیر و سیاحت کے محرکات کا تعلق ہے تو عہد قدیم سے لے کر اب تک تجارت، حصول علم و عبرت، تبلیغ دین، سیاسی مقاصد براری، تلاشِ معاش اور زیارت مقامات مقدسہ وغیرہ وہ چند مقاصد ہیں جنھوں نے نسل انسانی کے پاؤں میں چکر ڈال رکھا ہے اور یوں ان متنوع مقاصد کے حامل اسفار نے مختلف سفرناموں کو جنم دیا ہے جو دیس دیس کی تاریخ، تہذیب، تمدن، تصور کائنات، عادات، رسوم، رواج، رجحانات، میلانات اور علوم کا ایک وسیع خزانہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور جو بعض صورتوں میں تاریخ تہذیب و تمدن کا سب سے اہم اور بنیادی ماخذ سمجھے جاتے ہیں''۔(1)

اقسام سفر

سفر کو اپنے مقاصد اور محرکات کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

مذہبی سفر: جس میں حج بیت اللہ شریف کے علاوہ مقدس مقامات کی زیارت اور مذہبی اجتماعات میں شرکت شامل ہے۔

ادبی سفر: جن میں سیمیناروں اور مشاعروں وغیرہ میں شرکت مقصود ہوتی ہے۔

تعلیمی اور علمی سفر: جو حصول تعلیم یا معلومات حاصل کرنے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں طالب علم یا محققین دوسرے شہروں یا ملکوں میں جاتے ہیں، لائبریریوں میں بیٹھتے ہیں، اہل قلم سے ملاقاتیں کرتے ہیں یا درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

کاروباری یا تجارتی سفر: یہ سفر خالصتاً تجارت کی غرض سے کیا جاتا ہے، تاجر کچھ خریدنے یا فروخت کرنے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتے ہیں۔

سیاسی سفر: یہ سفر خیر سگالی کے طور پر یا کسی ملک سے تعلقات استوار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، اس میں سفیروں، سرکاری نمائندوں اور صحافیوں کے سفر بھی شامل ہیں۔

شاہی سفر: یہ سفر کسی فرمانروا کا سفر ہے یا اس کی معیّت میں اس کے مصاحب، گائڈ یا خدام وغیرہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، اس سفر میں فرماں روا کے علاوہ سبھی کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور مسافر کا اپنی آنکھوں سے دیکھنا اپنے کانوں سے سُننا اور اپنے دماغ سے سوچنا محال ہوتا ہے۔

جنگی سفر: یہ سفر اس وقت کیا جاتا ہے جب دشمن سے برسر پیکار ہونے کی نوبت آجائے۔

مرحاتی سفر: یہ زندگی کو خطرات میں ڈالنے والا سفر ہے اور کسی ایسے کام کے لیے کیا جاتا ہے جسے کرنا سہل نہ ہو، ایڈونچرس کے دلدادہ اولوالعزم انسان یہ سفر ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ ابن بطوطہ، کولمبس اور واسکوڈی گاما جیسے بے شمار افراد نے اپنی جانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس قسم کے کارنامے انجام دیے ہیں جو انسان کی پیشانی کو روشن اور سر کو بلند کرنے کا وسیلہ بنے۔

خیالی یا تصوراتی سفر: اس قسم کے سفر میں انسان اپنی خواہشات سفر کی تکمیل کے لیے تصور کا سہارا لیتا

ہے اور کسی ایسی دنیا میں جا نکلتا ہے جو اس کے حسین خوابوں کی تعبیر ہو۔ شاعروں اور ادیبوں نے ایسے خیالی سفر بہت کیے ہیں اور ناولوں، افسانوں، داستانوں اور شاعری کے دامن کو سفر ناموں کے ادب سے بھر دیا ہے، کچھ ادیب اور شاعر جنت کی سمت جا نکلے ہیں اور بہتوں نے اپنی جنت اسی دنیا میں تعمیر کر لی ہے، کوئی چاند تاروں میں پہنچا تو کسی نے آسمانوں کی سیر کی۔

سفر ہجرت: انتقال مکانی کی ایک شکل ہے کسی سیاسی مصلحت یا سماجی، معاشی اور مذہبی مجبوری کی وجہ سے عارضی طور پر یا مستقلاً اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہونا ہجرت کہلاتا ہے۔ حضورا کرم ﷺ نے کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی تھی۔ اسلام میں اس ہجرت کی بڑی اہمیت ہے۔

تفریحی سفر: اس سفر کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ سفر جو عارضی قسم کی چھوٹی موٹی تفریحات کی غرض سے کیا جاتا ہے اور جس پکنک، ٹورس یا اسی قبیل کے مختصر سیر سپاٹے مقصود ہوتے ہیں، دوسرا وہ سفر ہے جو خالصتاً سیاحت کی غرض سے کیا جاتا ہے یہ سفر دوسرے اسفار سے بالکل مختلف ہوتا ہے اس میں عازم سفر ایک سیاح کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

سفر اور سیاحت میں فرق

سفر اور سیاحت میں واضح فرق ہے۔ ایک عام مسافر کے برخلاف سیاح کا مقصود سفر بھی سفر ہی ہوتا ہے۔ سیاح کو کسی دوسرے کام سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ہر رہ گزر ایک منزل اور ہر منزل رہ گزر بن جاتی ہے وہ تمام مناظر کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتا ہے کہ خود بھی مناظر فطرت کا ایک حصہ بن جاتا ہے، وہ کوئی پابندی اور کسی نظام الاوقات کا تابع نہیں ہوتا، اس کی دلچسپیاں ہی اس کا نظام الاوقات ہوتی ہیں، سفر اس کے لیے زحمت نہیں رحمت ہوتا ہے، وہ سفر کو اکتساب مسرت کا وسیلہ سمجھتا ہے، سفر اس کے لیے کسی مجبوری کا نام نہیں بلکہ شوق کی

تکمیل کا خود اختیاری ذریعہ ہوتا ہے۔اور زندگی کے ہر لمحے کو حصول مسرت کا خزینہ تصور کرتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے مسافر اور سیاح کے فرق کو نہایت خوبی سے واضح کیا ہے۔وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''سیاح کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے منقطع ہو کر کسی غیر مادی شئ کی طرح سبک اور لطیف ہو جاتا ہے اور حد بندیوں کی تج کر ایک آوارہ جھونکے کی سی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہو کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا بڑھتا چلا جائے لیکن سیاح مکڑی کے جالے سے یکسر آزاد ہے۔گھر کی دیواروں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اسے کوئی سروکار نہیں۔۔۔ سیاح تو اپنا راستہ خو بنا تا ہے۔۔۔جب کہ مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے''۔(2)

سفر کی ضروریات

سفر کی طرح سفر کی وسائل وضروریات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ایک وقت تھا جب سفر کرنا اتنا آسان نہ تھا بلکہ انتہائی مشکل اور دشوار گزار ہوا کرتا تھا، فی زمانہ یہ بات نہیں ہے، اب آمد و رفت نہایت آسان، محفوظ اور تیز رفتار ہے، مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بعافیت طے ہو جاتا ہے، ان سہولتوں کی وجہ سے ذوقِ سفر میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا ہے، یا تو لوگ گھر سے باہر نکلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے یا اب انھیں گھر میں بیٹھنا گران گزرتا ہے۔آج کی دنیا میں سفر کے بے شمار ذرائع ہیں جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو آناً فاناً ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔ان ذرائع نے زمین کے طول وعرض کو مختصر ترین کر دیا ہے، ان مقامات پر جہاں کبھی شاعر اور ادیب تخیلی اور تصوراتی سفر کرتے تھے اب انسان اپنے مادی جسم کے ساتھ پہنچے کی تیاری کر رہا ہے۔آج انسان زمین سے نکل کر خلائے بسیط میں چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ بہر حال سفر کے جدیدی ترین ذرائع نے سارے فاصلوں کو اس طرح

سمیٹ لیا کہ راہ کی تمام دشواریاں ماضی کا حصہ بن گئیں۔ دورحاضر میں ریل، موٹر، ہوائی جہاز، پانی کے جہاز وغیرہ اجتماعی سفر کے تیز تر اور محفوظ و آرام دہ ذرائع ہیں۔ انفرادی سفر کے لیے سائیکل اور موٹر سائیکل کا استعمال عام ہے۔ بعض علاقوں میں گھوڑوں کی سواری کا رواج بھی باقی ہے، ان تمام سواریوں کے باوجود کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں محفوظ ترین سفر پیدل ہی کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ پیدل سفر کے زیادہ شائق ہوتے ہیں اور راستوں کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے سواری پر پیدل چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر شخص ہر قسم کے اخراجات سفر کا متحمل نہیں ہوتا، بعض علاقے اپنی من پسند سواری کے بغیر سیاح کو موقع کی مناسبت سے سفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، میدانی، پہاڑی، ریگستانی، بحری اور فضائی سفر کے لیے الگ الگ مطالبات ہوتے ہیں جو ایک مسافر کو بہرحال پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے ملک اور مانوس علاقوں کے سفر اور انجانی، غیر مانو راہوں کی مسافت میں بھی بہت فرق ہے۔ دوسرے ملکوں میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسافر تنہا ہے تو اسے بہت سی مشکلات سے خود ہی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے نامساعد حالات میں یا بیمار ہونے کی صورت میں اسے اجنبیت کا شدید احساس ہوتا ہے اور غربت اس کے لیے تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ اجتماعی سفر کے کچھ فوائد ہیں تو کچھ ذمیداریاں بھی ہیں، طبیعتوں کا رات دن ایک ساتھ رہنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا کوئی آسان کام نہیں اگر مزاجوں میں ہم آہنگی اور مناسبت یا طبیعت میں کشادگی، ایثار اور برداشت نہ ہو تو سفر کا سارا مزا کرکرا ہو سکتا ہے۔ ایک اچھے اور سچے مسافر کو ان سب باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو یہ نہ ہو تو سفر ایک مصیبت بن جاتا ہے۔

ذرائع سفر میں پیروں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ سفر کا جتنا اور جیسا تعلق پیروں سے ہے اتنا کسی اور سے نہیں، تمام سواریوں کی سہولتوں کے باوجود سفر میں پیروں کی سب سے زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے۔ رحمٰن مذنب لکھتے ہیں:

''سفر میں مسافر یا سیاح کے پاؤں سب سے زیادہ ضروری اور کارآمد

ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ گھوڑے گدھے، اونٹ، بیل گاڑی اور بہلی نے
صدیوں تک آدمی کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ماضی میں آدمی نے پاؤں
اور سواری کی مدد سے بڑے بڑے طویل فاصلے روند ڈالے۔ طالبان علم وفن،
بزرگان دین اور اہل شوق وبصیرت کو جلا بخشنے اور بصارت کو کشادہ کرنے کی غرض
سے جان لیوا فاصلے طے کر کے دنیا بھر میں بکھری ہوئی درس گاہوں تک پہنچے،
وہاں فقہا، محدثین، علماء، ائما اور متخصصین سے اکتساب علم کرتے۔ وقت کی بچت
اور فاصلوں کی تسخیر مزید کے لیے پہیہ ایجاد ہوا''۔(3)

سفر کی اہمیت اور افادیت

سفر سے تعلقات میں افافہ، تجربات میں وسعت اور مشاہدات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے، اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو پرکھنے اور اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے۔ عظیم شخصیات سے ملاقاتوں کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ دنیا جہان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اعتماد پیدا ہوتا ہے، نگاہ میں بلندی، سخن میں دل نوازی اور روح مین بالیدگی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کی دید سے قلب ونظر مین کشادگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی ہمہ جہات ترقیات سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل ہوتی ہے، اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذاتی اور نجی طور پر حاصل ہونے والی واقفیت بالواسطہ یا ثانوی حیثیت سے حاصل ہونے والی واقفیت سے زیادہ بہتر، ٹھوس اور لائق اعتبار ہوتی ہے۔ اسی طرح براہ راست اور بالواسطہ تاثرات اور کیفیات میں بھی بہت فرق ہے، مثال کے طور پر تاج محل کے بارے میں کتابوں میں لکھی ہوئی جملہ تفصیلات پڑھنے اور دوسروں کی زبان سے تمام جزئیات کا علم حاصل ہونے کے باوجود وہ کیفیت طاری نہیں ہوسکتی جو تاج محل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہوتی ہے، تاج محل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے سفر کرنا بہر حال ضروری ہے۔ جب ایک سیاح نئی دنیاؤں کی کھوج میں گھر سے نکلتا ہے اور ان گنت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، یہ کامیابی اس کے لیے حیات جاوداں بن جاتی ہے۔

سفر نامے کا فن

سفر نامے کے لیے کوئی خاص تکنیک، خاص ہیئت یا اسلوب وضع نہیں کیا گیا ہے۔سفر نامہ نگار اپنے مزاج، تجربات اور تخلیقی صلاحیت کے مطابق سفر نامے کا اسلوب، تکنیک یا ہیئت متعین کرتا ہے۔گویا سفر نامہ نگار آزاد ہے جس طرح چاہے اسے تحریر کرے۔مگر اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ سفر نامہ سفر نامہ رہے، داستان، ناول یا افسانہ نہ بن جائے۔اس میں پُر اسراریت اور دلچسپی بڑھانے کے لیے غیر ضروری رنگین بیانی، افسانویت یا مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

بہرحال! فنی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو زیادہ تر سفر نامے بیانیہ انداز میں ہی لکھے گئے ہیں۔قدیم سفر نامے تو بیانیہ میں تھے ہی مختلف اسالیب اور طرز بیان کے اختلاف کے باوجود جدید سفر نامے بھی بیانیہ میں ہی لکھے جا رہے ہیں۔سفر نامے کا مرکزی کردار سفر نامہ نگار ہی ہوتا ہے۔جو واحد متکلم میں اپنی رودادِ سفر بیان کرتا ہے۔البتہ وہ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔

1۔سیاح سفر کے وواقعات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور سفر نامہ لکھتے وقت ذہن پر زور دے کر ان واقعات کو قلم بند کر لیتا ہے۔اس طریقہ کار میں خرابی یہ ہے واقعات ذہن سے محو ہو سکتے ہیں اور ان کا تاریخی تسلسل بگڑ سکتا ہے۔

2۔ اس میں سفر نامہ نگار اہم واقعات، تاثرات اور خاص باتوں کو کسی ڈائری میں تاریخی ترتیب سے نوٹ کر لیتا ہے۔ یہ ایک بہتر طریقہ ہے جس میں واقعات کی سچائی، ان کا سیاق وسباق، جزیات اور فوری ردِعمل تاریخی ترتیب کے ساتھ محفوظ ہا جاتا ہے۔

3۔تیسرا طریقہ خطوط کی تکنیک ہے۔سفر نامہ نگار دورانِ سفر جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے خط کی شکل میں لکھ کر کسی دوست یا عزیز کو بھیجتا ہے یا نہیں بھیجتا ہے۔بعد کو انہیں خطوط کی مدد سے سفر نامہ تیار کر لیتا ہے۔

لیکن یہ طریقہ زیادہ موثر اسی وقت ہوتا ہے جب مصنف اپنے تجربات وتاثرات کوتازہ بہ تازہ ضبط تحریر میں لے آئے۔خطوط کی ہیئت میں لکھے گئے سفرناموں میں واقعات کے منطقی ربط و تسلسل کو قائم رکھنا مشکل ہوجاتا ہے کیوں کہ دو خطوط کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے ، اس درمیان کے واقعات کی کڑیوں کو وہ اپنی یادداشت کی بنا پر جوڑتا ہے جس سے سچائی، بے ساختگی اورتازگی میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔پھر بھی ڈائری کی طرح خطوط بھی دورانِ سفر ہی لکھے جاتے ہیں اس لیے ان میں قاری کی دلچسپی کا کافی سامان ہوتا ہے۔

درحقیقت وہی سفرنامہ زیادہ کامیاب ہوتا ہے جس کے لیے سیاح پہلے سے سیاح پہلے سے منصوبہ بنائے کہ اسے اپنے سفر کی روداد بھی تحریر کرنی ہے۔پھر وہ اپنی اہلیت اور پسند وناپسند کے مطابق تکنک بھی وضع کر لیتا ہے،تکنک کے تعین کے بعد پہلا مرحلہ آتا ہے انتخابِ واقعات کا۔دوسرا مرحلہ آتا ہے ان واقعات کی پیش کش کا۔کس چیز کونظر انداز کرنا ہے، کس چیز پر زیادہ زور دینا ہے، کیا بات اہم ہے اور کونسی غیر اہم یہ فیصلہ ہی کسی سفرنامے کو دلچسپ بناتا ہے۔مزید یہ کہ سفرنامہ نگار ان واقعات کو اس طرح پیش کرے گویا قاری انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔پورا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔سفر کی جزیات کو اس طرح پیش کرے کہ تمام مناظر قاری کے سامنے رقص کرنے لگیں۔

تیسرا مرحلہ زبان و بیان کا آتا ہے۔یعنی زبان و بیان خیال و واقعات سے مناسبت رکھتے ہوں۔اسلوب میں تازگی و شگفتگی ہو اور یہیں سے بات پہنچتی ہے اس کی ادبیت تک۔کسی بھی تحریر کی اہمیت اس کے ادبی حسن میں پوشیدہ ہوتی ہے اور سفرنامہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔اگر کوئی سفرنامہ ادبی حسن سے عاری ہے تو اس کی اہمیت صرف ایک سفری بیان کی سی ہوگی۔سفرنامے میں ادبیت پیدا ہوتا ہے زبان و بیان کی سادگی، سلاست روانی اور الفاظ کی مناسب ترتیب سے۔ڈاکٹر وحید قریشی کے الفاظ میں:

’’(سفرنامہ نگار) لفظوں کے حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں
کاانکشاف کرتا اور داخل میں وارد ہونے والے ہر تجربہ کو لفظوں کی مدد سے جانچتا

اور پرکھتا ہے۔ان تجربات کومحسوس کی سطح پر لانے کے لیے لسانیاتی پیکر ایک نئی
کشفی حالت میں دوچار ہوتے ہیں۔
سفرنامے میں ایسے ایک دونہیں کئی مقام آتے ہیں۔کبھی یہ سفر خارج سے
داخل کا سفر ہے۔۔۔یا پھر داخل سے خارج کا سفر''۔(4)

ایک اچھے سفرنامے کی اہم خصوصیت اس کا ادبی حسن ہے۔ سفرنامہ نگار جو کچھ رقم کرے اس میں ادبیت ضرور ہونا چاہیے۔اگر کوئی سفرنامہ ادبی حسن سے عاری ہے تو اس کی حیثیت ایک سفری بیان سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفرنامہ نگار جب ادیب سے دور ہو جاتا ہے تو قاری بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے ادبی چاشنی ایک کامیاب سفرنامے کا جزو اعظم ہے۔ایک ادیب کا دل و دماغ اور گوش و نظر رکھنے والا سفرنامہ نگار ہی سفر کی جزئیات کو کامیابی سے سمیٹ کر حسین، دلکش اور جاذب توجہ اسلوب میں یوں پیش کر سکتا ہے کہ واقعات کے تمام مناظر قاری کے سامنے رقص کرنے لگیں۔غیر تخلیقی انداز میں تحریر کیا ہوا سفرنامہ اپنی اہمیت اور افادیت سے محروم ہو جاتا ہے،اس قبیل کے سفرنامے ادب کے دائرے سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔غیر تخلیقی انداز میں مرتب کیے ہوئے سفرناموں کی عمر بہت کم ہوتی ہے، ایسے سفرنامے جلد فراموش کر دیے جاتے ہیں۔سفرنامہ نگار اگر اپنی عرق ریزی کو نتیجہ خیز، مفید اور پسندیدہ بنانے کا خواہشمند ہے تو ادبیت کے ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے سفرنامے کی کشش مین اضافہ ہو اور یہ کامیابی شگفتہ ادبی اسلوب کے وسیلے ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بیانیہ کو تاثیر وار مقبولیت بخشنے کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو داخلی طور پر توانا اور سچائی کا ضامن ہو اور شگفتہ ہونے کے باوجود سفرنامے کی سنجیدگی اور متانت کو مجروح نہ کرے۔اردو کے مشہور و معروف ادیبوں کے سفرناموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی خوبی سے دوران سفر پیش آنے واقعات کو ادب بنا دیا ہے۔سر سید اپنے وضاحتی انداز بیان سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں،شبلی بے خطابت بیان کے وہ جوہر دکھائے ہیں۔کہ ان کی تحریر ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دینا آسان کام نہیں،محمد حسین آزاد کی جمال آفرینی کا یہ حال ہے کہ کوئی بد مذاق ہی ہوگا جو ان کی تحریر کو پڑھنے کی حسرت نہ رکھتا ہو۔لیکن سفرنامہ لکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لکھنے والا ادیب ہی ہو، اس لیے کہ نہ تو ہر

ادیب کا سفر کرنا ضروری ہے اور نہ ہر سفر نامہ نگار کو ادیب ہونا لازم ہے۔ اجنبی واقعات اور پُرکشش مناظر کے ساتھ زبان و بیان میں بھی تازگی ہو تو قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور سفر نامہ نگار کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> ''سیاحت کے ثمرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں اس لیے سفر ناموں کا بیان بھی منہ بسورنے اور آہ و زاری کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تخلیقی سفر ناموں کی شگفتہ بیانی راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔ فطری سیاح اپنے منتخب کردہ پر صعوبت سفر کے مآل پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے سو طے پایا کہ اس کے لیے شگفتہ اور سبک اندازِ تحریر مناسب ہے لیکن نہ اتنا کہ پھکڑ بازی کے حدود کو چھونے لگے''۔(5)

الفاظ ایسے ہوں جو واقعات، موحول اور صورت حال کو واضح کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بیان میں جامعیت ہونی چاہیے۔ چست جملے، محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال اور اشعار یا مصرعوں کے بر محل استعال کے ذریعے شگفتہ ادبی اسلوب اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ سفر ناموں کے لیے شگفتہ اور سبک انداز تحریر ہی مناسب ہوتا ہے۔ متحیر کر دینے والے نئے نئے واقعات اور پُرکشش مناظر کے ساتھ سفر نامے کی زبان و بیان میں تازگی بھی ہو تو قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے مشکل الفاظ، پیچیدہ جملے اور فلسفیانہ اندازِ تحریر مناسب نہیں ہوتا۔

آثار قدیمہ، دریا، پہاڑ، جھرنے، سمندر کے فطری مناظر، سفر نامہ نگار کو متاثر ضرور کرتے ہیں، مگر ان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی سفر نامے کی اہمیت کم کر دیتی ہے۔ اسے ان تاثرات، محسوسات اور لطیف کیفیات کو بیان کرنا چاہیے جو ان چیزوں سے اس کے اندر پیدا ہوئی ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اچھا سفر نامہ نگار قاری کو اپنا ہم سفر بنا لیتا ہے۔ قاری وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جو اس نے دیکھا ہے، قاری وہ سب کچھ محسوس کر لیتا ہے جو اس نے محسوس کیا ہے۔ یہاں تک کہ قاری سفر نامہ نگار کے تجربات و

مشاہدات میں شریک ہوجا تا ہے۔مگر یہ اوصاف اس وقت تک پیدا نہیں ہوتے جب تک سفر نامہ نگار کو بات کہنے کا سلیقہ نہ آتا ہو اور اس کے طرز نگارش میں خلاقانہ بصیرت نہ ہو۔ مناظر کی روح میں اتر جانے کے بعد مناظر کو تحریر کی روح میں اتار دینے کا وہ سلیقہ نہ رکھتا ہو۔

سفر نامے میں مختصر نویسی یا ضرورت سے زیادہ اختصار، واقعات اور مناظر کو دھندلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح بلا ضرورت طولِ کلام اس کے فن کو مجروح کر دیتا ہے۔

سفر نامہ ایک قدیم بیانیہ صنف ادب ہے۔ سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات واحساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے، سفر نامے کا تمام تر مواد مسافر کے گردو پیش میں بکھرے ہوئے مناظر و واقعات سے اخذ کیا جا تا ہے۔لیکن ایک مسافر کی آنکھ بے جان کیمرے کی آنکھ نہیں جو صرف تصویر کشی کرنے کے بعد بری الذمہ ہو جاتی ہے، سفر نامہ نگار ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل و دماغ اور جذبات واحساسات کی آنکھ سے اشیاء کو دیکھتا اور پرکھتا ہے اور پھر اپنی رائے قائم کر کے اس کو بیان کرتا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والے تمام جاندار اور بے جان مناظر و مظاہر اور واقعات و حادثات اسے متاثر کرتے رہتے ہیں اس پر ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور وہ ظاہری چیزوں کو دیکھ کر اپنے باطن کی آواز بھی سنتا ہے، اس کے اندر سے نکلنے والی یہی آواز دراصل اس کا احساس، اس کا جذبہ اس کا تاثر، اس کا ردعمل اور اس کی رائے ہوتی ہے۔ جسے وہ اپنے علم کی روشنی سفر نامے کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ سفر نامہ نگار کا علم جیسا تازہ، تجربہ جیسا وسیع، خیال جیسا نیا اور فن جیسا پختہ ہوتا ہے سفر نامہ ویسا ہی معتبر، دلچسپ اور معلومات افروز ہو جاتا ہے۔

سفر نامہ نگار اپنے عہد کو تجسس بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے سفر نامے کو ضبط تحریر میں لانے کی روایت سے بہت پہلے جب پہلا انسان زمین پر آیا اس کی نگاہوں میں احساس محرورمی کے ساتھ ساتھ تجسس بھی موجود تھا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام وہ پہلے انسان ہیں جو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا بھیجے گئے اور وہی انتقال مکانی کسی انسان کا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی انسانی ضرورت میں اضافہ ہوتا گیا،

اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسب معاش اور تلاش مسکن میں انسانی آبادیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگیں، پھر آہستہ آستہ دنیا ایک ایسے سماجی ماحول میں داخل ہوگئی جس میں رہ گئی جس میں رہ کر انسان تلاش معاش مین طویل فاصلے طے کرنے لگا، اسی تلاش وجستجو نے انسان کو نئی نئی زمینوں سے متعارف کرایا۔ نتیجہ کے طور پر گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوتا گیا پھر یہ قبیلے اپنی بنیادی ضروریات مثلاً کھانا پینا، لباس اور رہائش وغیرہ کی فکر میں ادھر ادھر بھٹکنے لگے، انھیں قبیلوں سے قوموں کے بننے کا عمل شروع ہوا، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں نے قصبوں کی شکل اختیار کر لی، قصبے شہر بنتے گئے اور شہروں نے آبادی کا بڑا حصہ اپنے اندر سمیٹ لیا۔ دیہاتوں، قصبوں اور شہروں نے مجتمع ہو کر مملکتوں کو جنم دیا۔ مملکتوں کے باشندے تلاش وجستجو کی راہ سے ایک دوسرے کے شہروں اور ملکوں میں آنے جانے لگے اسی آمد ورفت کے نتیجے میں سفرنامے وجود میں آئے۔ آبادیوں میں اضافے کے ساتھ سفرنامہ نگار کے تجسس اور شوق میں اضافہ ہوتا گیا۔

قدیم زمانے میں سفر کی طرح سفرنامہ بھی کسی نہ کسی مقصد کی ڈور میں بندھا ہوا تھا۔ اگلے وقتوں کے بیشتر سفرناموں میں مقصد کی کارفرمائی صاف دکھائی دیتی ہے۔ سفرنامہ نگار اجنبی سرزمین یا دیارِ غیر کو آزادانہ طور پر دیکھنے اور اپنے محسوسات کا ایک آزاد سیلانی ناظر کی طرح اظہار کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس کی نظر میں سفرنامہ مفید معلومات جمع کرنے کا وسیلہ ہے۔ پرانے زمانے میں بیشتر افراد کے سفر کا خاص مقصد بیرونی دنیا کی خارجی معلومات میں اضافہ کرنا تھا اور سفرنامہ لکھنے کا مقصد خارجی معلومات کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ پرانے زمانے میں جب آمد ورفت دشوار تھی اس قسم کے معلومات افزا واقعات اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ تاریخی واقعات اور آثار قدیمہ سے متعلق قصے کہانیاں یا مناظر فطرت کے، مرقعے ہر چیز کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے طبیعت بے چین رہتی تھی۔ دیارِ غیر کے باشندوں کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے سے لے کر ان کے مذہب، ادب، معاشرت اور تعلیم وتربیت سے متعلق بہت سی باتیں ایسی تھیں جن میں داستانوں کا لطف آتا۔ جدید دنیا نے بہت سے نئے موضوعات میں انھیں سفرناموں سے استفادہ کیا ہے۔ سفرنامہ کسی ملک کے تاریخی شواہد کو نظرانداز نہیں کرسکتا اور

نہ جغرافیائی کوائف سے نظر بچا کر نکل سکتا، مسافر کھلی آنکھوں سے سفر کرتا ہے، عظیم الشان قدیم محلات، بلند و بالا درو دیوار، پختہ مقابر، حسین مساجد، خوبصورت محرابیں اور سیکڑوں آثار قدیمہ زبان حال سے ماضی کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ مسافر ماضی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے تاریخ کے دائرۂ اختیار میں داخل ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ عظیم الجثہ پہاڑ، میٹھے اور گنگناتے چشمے، وسیع وعریض میدان، بہتے دریا، گہرے اور بیکراں سمندر مسافر کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور مسافر فطرت کے ان ساحروں کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں تاریخ و جغرافیہ کے دائرۂ اثر سے باہر نکلنا کسی سفر نامہ نگار کے لیے ممکن نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سفر نامہ تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب ہو کر رہ جائے اور اس کے اندر کا مسافر مورخ یا جغرافیہ دان کے فرائض انجام دینے لگے۔ سفر نامہ نگار اگر موسموں کے احوال پہاڑوں کی بلندی اور دریاؤں کی گہرائی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تو سفر نامے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ سفر نامہ نگار کو ساکن و جامد اشیاء کی جگہ ان لطیف کیفیات پر زیادہ توجہ صرف کرنی چاہیے جنھوں نے اس کی بصری قوتوں کو متاثر کیا ہے۔ تاریخی شواہد اور جغرفیائی کوائف سفر نامہ نگار کو ظاہری طور پر متاثر کرتے ہیں یہ تاثر معلوماتی کم اور محسوساتی زیادہ ہوتا ہے، سفر نامہ نگار اسی تاثر کو قاری میں منتقل کرنے کی سعی کرتا ہے، یہ کوشش جتنی زیادہ طاقتور ہوگی اتنی ہی زیادہ کامیاب بھی ہوگی اور جتنی زیادہ کامیاب ہوگی قاری سے اتنا ہی گہرا رشتہ استوار کر سکے گی، اس کے برعکس سفر نامہ نگار اگر ثانوی ماخذات سے کام لیتا ہے تو نہ وہ تاریخ وجغرافیہ کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے نہ سفر نامہ کے ساتھ۔ کسی علاقے کی مربوط تاریخ پیش کرنا سفر نامہ نگار کی ذمہ داری نہیں۔ سفر نامہ اس طرز عمل کا متحمل نہیں ہو سکتا تاہم سفر نامہ نگار اپنے عہد کے تاریخی شواہد کو تخلیقی انداز سے برتنے کی کوشش کر سکتا ہے اگر چہ آج صورت حال مختلف ہے، آج کا قاری سفر نامہ نگار سے تاریخ و جغرافیہ یا سیاست و معاشرت پڑھنے کا خواہش مند نہیں یہ ساری چیزیں اسے بغیر کسی کاوش کے میسر ہیں۔

آج دنیا سمٹ کر مختصر ہو گئی ہے چند ثانیوں میں دنیا کے کسی بھی گوشے سے رابطہ قائم ہو سکتا ہے، گھر بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کے تاریخی آثار اور جغرفیائی مناظر سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے، ٹیلی ویژن نے ان ساری چیزوں کو ہمارے

سامنے پیش کر دیا ہے جنھیں تصور میں بھی نہیں لایا جا سکتا تھا۔ آج کا بچہ بچہ اپنے دماغ میں معلومات کا ایسا وسیع ذخیرہ رکھتا ہے جو بزرگوں کو عمر عزیز کا بڑا حصہ گزارنے کے بعد بھی نصیب نہ تھیں، اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ سفرنامے کے مقاصد، اسالیب اور دوسرے رویوں میں بھی فرق آ جانا ایک فطری بات ہے۔ جہاں تک قدیم سفرناموں کا تعلق ہے یہ سفرنامے سوانحی، جغرافیائی اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ ہیں۔ دنیائے ادب کے محترم سفرنامہ نگاروں نے اپنے مشاہدات سفر کی روشنی میں ایسی بیش بہا معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ آنے والی نسلیں دیر تک فائدہ حاصل کرتی رہیں گی۔

سفرنامہ صرف انسانی تجربات ومشاہدات اور ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والے حالات وواقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ سیاح کے اپنے احساسات اور تاثرات کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ سیاح جب کسی نئے علاقے سے گزرتا ہے، اجنبی اشخاص سے ملتا ہے، نئے مناظر سے آنکھیں چار کرتا ہے، غیر مانوس راستوں پر سفر کرتا ہے، مختلف چھوٹے بڑے حادثات سے نبرد آزما ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے اور اس کے احساسات وتاثرات کس قسم کے ہوتے ہیں، اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ایک بات کا جاننا کافی ہے کہ اگر وہ واقعی سیاح ہے اور سفر اس کی مجبوری نہیں یا سفر کے پیچھے کوئی عارضی اور مادی مقصد پوشیدہ نہیں بلکہ سفر برائے سفر ہے تو فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے اور باسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے سیاح پر کسی منفی رویے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ راہ کی رکاوٹیں اور پریشانیاں سیاح کے شوق بے پایاں کو مہمیز کرتی ہیں، حادثات اس کے عزم اور حوصلے کو صیقل کرتے ہیں۔ سیاح جب کسی نئے ملک سے گزرتا ہے تو وہاں کے رسم ورواج دیکھ کر فطرتاً اپنے ملک کے رسم ورواج سے موازنہ کرتا ہے، موازنے کے نتیجے میں اگر اسے اپنے معاشرے میں زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں تو جذبہ تفاخر سر ابھارتا ہے اور اسے مسرتوں سے ہم کنار کرتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو احساس کم تری اور احساس ندامت کا شکار ہو جاتا ہے، وہ سوچنے لگتا ہے کہ میں اور میرا ملک اتنے کمزور اور کمتر کیوں ہیں؟ سفرنامہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو، زندہ عہد یا حالات حاضرہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سفری تجربات ومشاہدات کو قلم بند کرنے والے دوسرے مسافروں کی راہوں کو آسان کر دیتے ہیں۔ اچھا سفرنامہ نگار

قاری کو اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔ قاری وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جو سفر نامہ نگار نے دیکھا ہے، وہ سب کچھ محسوس کرتا ہے جو سفر نامہ نگار نے محسوس کیا ہے، اس کے تجربات میں شریک ہوتا ہے، اس کے مشاہدات پرکھتا ہے۔ اس کی تحریر کا انداز جتنا دلکش ہوگا قاری اتنی ہی دلچسپی سے مطالعہ کرے گا۔ چناں چہ صحیح طریقہ یہ ہے کسی کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے سے پیشتر تحقیق ضرور کی جائے۔ بقول انور سدید:

''سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں بشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوش گوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مشاہدہ کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے۔ اور اس میں مکمل کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بہ خوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو''۔(6)

یہاں یہ بات صاف کر دینا مناسب ہوگا کہ ایک سفر نامہ نگار کا ادیب ہونا ضروری نہیں، اس میں ایسے ادبی اوصاف ہونا کافی ہیں جو اس کے تجربات و مشاہدات کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کا اتنا سلیقہ رکھتے ہوں کہ وہ تمام واقعات اور اشیاء جنھیں سفر نامہ نگار نے دیکھا اور محسوس کیا ہے، قاری بھی محسوس کر سکے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک:

''ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحہ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشہ، نغمہ و نکہت کا ہر صوت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو

کر بیان کو مرقع بہار بنا دے اور قاری ان تمثالوں میں جذب ہو کر خود کو اس
مرکب آئینہ گری کا حصہ بنائے''۔(7)

قدیم و جدید سفر ناموں کے مابین فرق

قدیم سفر ناموں کی بہ نسبت جدید سفر ناموں میں تخلیق بیانی پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔قدیم سفر نامے کسی نہ کسی مقصد کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں،ان میں بیشتر سفر ناموں کا مقصد معلومات فراہم کرتا ہے،یہی وجہ ہے کہ قدیم سفر ناموں میں تاریخ وجغرافیہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔تاریخ وجغرافیہ کے علاوہ تہذیب وتمدن،تعلیم و تربیت،سیاست ومعاشرت غرض انسانی مفادات کے تمام پہلوؤں پر ہمہ وقت نظر رکھی گئی ہے۔نیا سفر نامہ دوسروں سے زیادہ اپنے لیےلکھا گیا ہے جدید سفر نامہ نگار کو دوسروں کی اتنی پرواہ نہیں جتنی خود کی ہے۔آج کا سیاح دوسرے مما لک کی تہذیب،معاشرت کی جانچ پڑتال کی غرض سے گھر سے نہیں نکلتا، بلکہ سفر اس کے لیے ذاتی واردات اور سفر نامہ ذاتی واردات کا اظہار ہے۔ نیا سفر نامہ اپنے اظہار بیان کے وسیلے سے افسانے کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ڈاکٹرمسعود انور سفر نامے کے اس رویہ کی تحسین کرتے ہیں،ان کا خیال ہے کہ:

> ''سفر نامے کا سب سے قیمتی جزو اس کا افسانوی عنصر ہے،قدرت نے جب انسان کو بنایا تو اس کے وجود کو تراشتے وقت اس کے سینے میں چپکے سے داستان کی دیوی کی محبت کو بھی بٹھا دیا، داستان کے اس حصے نے جس میں حالات سفر بیان ہوتے تھے سفر نامہ کی شکل اختیار کر لی اور اردو میں ایک ایک صنف کا اضافہ ہوا جس کے ذریعہ آنکھوں دیکھے مشاہدے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے''۔(8)

افسانے کے تخلیقی آداب اور فنی مطالبات سفر نامے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں،سفر نامہ ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتا ہےاور دیکھی ہوئی اشیاء کو اپنے تاثرات کے حوالے کر دیتا ہے۔آنکھوں دیکھی حقیقتوں کا اپنے باطن کی

کیفیات سے موازنہ کرتا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والے واقعات میں وہ بذات خود شریک رہتا ہے، یہ اس کے ذاتی تجربات ومشاہدات ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنے سفرنامے میں اپنے ہی نام سے پیش کرتا ہے۔ سفرنامے کا سب سے بڑا کردار خود سفرنامہ نگار کی ذات ہے۔ افسانے میں افسانہ نگار واقعات کے حوالے سے مختلف کردار تخلیق کرتا ہے۔ ہر کردار کا اپنا آغاز اور اپنا انجام ہوتا ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے سفر کی جزئیات پر بھی خاصی توجہ صرف کرتا ہے، اس کے پاس کافی وقت اور بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ سفرنامے میں کسی چیز کا مفصل بیان اور بھرپور تاثر پیدا کرنے کے لیے چھوٹی سی چھوٹی چیز کا تفصیلی ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے جب کہ افسانے میں جزئیات نگاری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ افسانہ تحریر کی طوالت کا متحمل نہیں ہوتا، اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کے چکر میں پڑنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ سفرنامے میں مختصر نویسی یا ضرورت سے زیادہ اختصار مناظر کی شکل وصورت دھندلی کر دیتا ہے، اس کے برعکس طوالت کلام کی وجہ سے افسانے کا فن مجروح ہو جاتا ہے۔

قدیم سفرناموں مین جہاں جذبات کی ضرورت ہوتی تھی وہاں جذبات موجود ہیں۔ سیاح ہمہ وقت جذباتیت کی چادر نہیں لپیٹے رہتا، اس کی شخصیت میں ایک پختہ اور مکمل انسان جو درہتا ہے جو نہ ہمہ وقت غمزدہ نظر آتا ہے اور نہ خواہ مخواہ ہنسنے ہنسانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے، اس کے تاثرات میں نہ تو جذبات کی بے جا فراوانی ہے اور نہ وہ جذبات سے عاری ایک خشک انسان نظر آتا ہے، وہ خوشی کے موقع پر خوشی اور غم کے موقع پر غم کا جذباتی اظہار کرتا ہے۔ کبھی تجسس سر اُبھارتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی حیرت واستعجاب اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے یں۔ اسی اصول کی بنیاد پر اس زمانے کے سفرناموں کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے تو ان کی وقعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، قدیم سیاحوں میں بعض ایسے بھی سفرنامہ نگار ہیں جو غیر ملکی فضا کی سحر انگیزی میں خود فراموشی کی حد تک ڈوبے نظر آتے ہیں۔ جذبات کی لہریں انھیں جدھر چاہتی ہیں بہا کر لے جاتی ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو فطرت کے مناظر اور شہروں کی رنگینی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اردو کے سب سے پہلے سفرنامہ نگار یوسف خان کمبل پوش ایک ایسے ہی سیاح ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو کلی طور پر لندن کے حوالے کر دیا ہے۔ ایسے اور بھی قدیم سفرنامے ہیں جن میں

تخلیق کی دلکشی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہے، ان کے علاوہ جو سفر نامے بے آب و گیاہ ریگستان کی طرح خشک اور بے کیف ہیں ان کے مصنفین نہ صرف یہ کہ ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے والے ہیں بلکہ انھیں لکھنے لکھانے کا سلیقہ بھی کم آتا ہے۔ ایسے لوگ جہاں جذبات کی لگام چھوڑ دیتے ہیں وہاں بھی اپنی تحریر کو تخلیق بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ جذبات و احساسات سے عاری تحریر ایک بے جان اور مردہ تحریر کے مترادف ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ عاری جذبات کی طرح حاوی جذبات بھی کوئی بہتر تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ اعتدال پسند قلم ہی ایک اچھا سفر نامہ تخلیق کر سکتا ہے، حقائق کو مبالغہ آمیز بنانے کی شعوری کوشش کبھی مستحسن نہیں سمجھی جاتی اپنی تعریف کے پہلو نکالنے کی خاطر کسی بات کو بلا وجہ گھٹا کر یا بڑھا کر بیان کرنے سے سفر نامے کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔

روایتی یا قدیم سفر ناموں میں وہ حرکت و عمل نہیں جو نئے اور غیر روایتی سفر ناموں کی خصوصیات ہیں۔ قدیم سفر نامے ایک خاموش فلم کی مانند ہیں جن کے احساسات کا اندازہ صرف چہروں کے تاثرات سے ہو سکتا ہے، اس کے علی الرغم نئے سیاح نے اشیاء کو گویائی عطا کی ہے۔ قدیم سفر نامے کا مسافر خارجی اشیاء سے دور کا واسطہ رکھتا ہے وہ اس کے بدن کا لمس اور لمس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ''لرزش خفی'' سے نا آشنا ہے۔ نیا سفر نامہ اس اعتبار سے بالکل نیا، مختلف اور منفرد ہے کہ اس میں تمام خارجی شواہد سیاح کی داخلی کیفیات سے بے پردہ اور بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ سفر اور سفر نامہ نگار ہر شئی میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے اور تمام واقعات اس کی ذات کا ہو جاتے ہیں، سفر نامہ نگار ہر شئی میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے اور تمام واقعات اس کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''روایتی سفر نامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایت سفر نامہ کیفیات سفر سے۔ مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا، زمان و مکان کا اسیر ہوتا ہے جب کہ کیفیات سفر قلمبند کرنے والا زمان و مکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفر نامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے''۔(9)

نئے سفر ناموں میں غیر جاندار اشیاء بھی جاندار کردار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پہاڑ، ندیاں، سناٹے، تنہائی،

شہر، ہجوم، در و دیوار، سڑکیں، گلیاں، ویرانے سبھی اس سے گفتگو کرتے ہیں اور سفر نامہ محض واقعات اور مناظر کا بیان نہیں رہتا بلکہ ایک سچے سیاح کی فکری اور روحانی واردات قلب ونظر بن جاتا ہے۔ جدید سفر نامہ نگار نے اپنی ذات کو ماحول میں سمونے اور شخصیت کو ماحول کا جز و بن جانے کی ترغیب دی ہے اور یہی عمل ہمارے زمانے کو نئے سفر نامے کی سب سے بڑی دین ہے۔ ابتداء میں جن لوگوں نے مغرب کا سفر کیا وہ نئی دنیا کی چمک دمک سے بہت زیادہ متاثر اور مرعوب ہو گئے، اس مرعوبیت نے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ ولایت کی ہر ادا انھیں اپنے وطن کی اداؤں سے بہتر نظر آنے لگی۔ سر سید نے 1869 میں انگلستان کا سفر کیا اس دوران میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، ان کے سفر نامے ''مسافرانِ لندن'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ہم وطن دوستوں کو دوران سفر انگلستان سے خطوط بھی لکھے۔ ایک خط میں اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان میں انگریزوں کی بد اخلاقی اور ہندستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ بدتر اور حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے نزدیک قابل معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ایسا کرتے ہیں اور میرا تو خیال ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے انھوں نے قائم کی ہے وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کی بے جا تعریف کیے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندستانی خواہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے سوداگر ہوں یا معمولی دوکاندار، تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل جب ان کا مقابلہ تعلیم، اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہی نسبت ہے جو ایک گندے جانور کو ایک خوبصورت اور لائق انسان سے ہوتی ہے۔ انگریز اگر ہندستانیوں کو بزدل اور جانور سمجھتے ہیں تو ان کے پاس اس کے وجوہ بھی ہیں۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اور ہر دم دیکھتا ہوں وہ ہندستان کے باشندوں کے

تصور میں بھی نہیں آ سکتا‘‘۔(10)

جدید سفر نامہ نگار نے ایسا کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، اسے نہ تو مصلح بننے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ مغرب کے وسیلے سے ترقی کے زینے طے کرنے میں قومی عافیت یا ملکی فائدہ نظر آیا بلکہ ہوا یوں کہ سفر نامہ اب ذہن کی طرف زیادہ مائل ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ نیا سفر نامہ غور و فکر کے زیادہ مواقع فراہم کرتا ہے، فکر کی گل کاری اور روح کی بالیدگی سفر نامہ نگار کے امتیازی اوصاف ہیں۔ جدید سفر نامہ خارجی معلومات فراہم کرنے پر یوں بھی اصرار نہیں کرتا کہ جدید دور میں معلومات حاصل کرنے کے وافر ذرائع موجود ہیں۔ نیا سفر نامہ فکری اور ذہنی تصادم کے وسیلے سے مختلف تہذیبوں اور نئے نظاموں کی بدولت عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کر رہا ہے۔

سفر نامے کے موضوعات اور اسالیب

سفر ناموں کے موضوعات کا تعین کرنے کے لیے اسے قدیم اور جدید کے خانوں میں بانٹنا ہوگا۔ قدیم سفر ناموں میں مقصدیت حاوی نظر آتی ہے، عموماً اس کا مقصد معلومات فراہم کرنا ہوتا تھا، اس لیے اس میں تاریخ و جغرافیہ کو زیادہ تر بنیادی موضوع بنایا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن تعلیم و تربیت اور سیاست و معاشرت کو بھی نظر میں رکھا گیا ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ انسانی مفادات سے متعلق موضوعات کو ان میں اہمیت حاصل ہے۔

ماضی کے بیشتر سفر نامہ نگاروں نے سفر میں پیش آنے والی دشواریوں، آسانیوں، سہولتوں، مقامی باشندوں کی رواداری، حسن سلوک یا سنگ دلانہ برتاؤ کو موضوع بنایا۔

پرانے زمانے میں بیشتر سفر ناموں کا مقصد بیرونی دنیا کے خارجی حالات و معلومات سے واقف کرانا تھا۔ مثلاً شبلی نعمانی اہل وطن کو اسلامی دنیا کے صحیح حالات سے واقف کرانا چاہتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا مقصد عام معلومات کے علاوہ مزارات کی زیارت تھا۔ حافظ عبد الرحمٰن امرت سری کا مقصد دوسرے ملکوں کے باشندوں کے عادات و اطوار، طریقہ معاشرت اور طرزِ تعلیم کے علاوہ اجنبی ملک کے انتظامی امور اور جنگی طاقت سے متعلق معلومات فراہم کرانا تھا۔

غرض یہ کہ تاریخ جغرافیہ، تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، ادب، مذہب اور اقتصادیات جیسے تعمیری و کار آمد

موضوعات اوران سے متعلق تفصیلات قدیم سفر ناموں میں بکھری پڑی ہیں۔ پرانے زمانے میں جب آمد ورفت کی جدید سہولتیں میسر نہ تھیں اور سفر ایک دشوار گزار مرحلہ ہوا کرتا تھا، اس قسم کے معلومات افزا موضوعات اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ دنیا کے کسی گوشے کے تاریخی واقعات ہوں، آثار قدیمہ کی پراسراریت ہوں، مناظر فطرت کے مرقعے ہوں، دیار غیر کے باشندوں کے کھانے، پینے، رہنے سہنے، پہننے، اوڑھنے، مذہب کو برتنے، غرض ادب تعلیم اور تربیت اور معاشرے سے متعلق کونسی معلومات ہیں جو آپ کے ڈرائنگ روام میں آن واحد میں مہیا نہ ہو جاتی ہوں۔ چناں چہ آج ان موضوعات میں قارئین کی دل چسپی کم ہوگئی ایسی صورت میں جدید سفر ناموں کے موضوعات میں تبدیلی آجانا ایک فطری بات ہے۔ آج کا سفر نامہ نگار دوسرے ممالک کی تہذیب ومعاشرت کی جانچ پڑتال کے بجائے اپنی ذاتی واردات کے اظہار پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ ہر شئ میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے اور تمام واقعات اس کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس بات کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قدیم سفر نامے ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتے ہیں اور جدید سفر نامے کیفیت سفر سے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم سفر نامہ معلومات کا گنجینہ ہوتا تھا جب کہ جدید سفر نامہ ادب سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔

سفر ناموں کے موضوع کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ سفر کے لیے کونسا وسیلۂ سفر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ سیاح نے کس مقام پر کتنا قیام کیا ہے۔ اس نے زیادہ دنوں تک رک کر چیزوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے یا وہاں سے سرسری گزر گیا ہے۔

سفر نامے کے حدود وامکانات

اردو میں بھی سفر نامہ نگاری کی عمر ڈیڑھ سو برس سے زیادہ ہے۔ روایتی انداز کے قدیم سفر ناموں کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے تو بھی سفر نامے نے موجودہ دور میں اتنی ترقی اور مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ آج تک اردو میں سینکڑوں سفر نامے لکھے جا چکے ہیں۔۔۔ محمد اکرام چغتائی لکھتے ہیں:

''دور حاضر میں سفر نامے نے ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں اور لکھنے والوں

نے اس میں موضوعات کے اعتبار سے اتنی وسعت اور تنوع پیدا کر دیا ہے کہ اب بلا شبہ سفر نامہ نگاری ایک مقبول ترین صنف ادب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اہل قلم سیاحوں نے جغراجیائی اور ماحولیاتی معلومات کو بیانیہ انداز میں قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو تخلیق کی سطح پر اتنی عمدگی اور چابک دستی سے تحریر کیا ہے کہ قاری ان کو پڑھتے ہوئے خود کو بھی لکھنے والے کا ہم سفر سمجھنے لگتا ہے، تجارتی مقاصد اور محض نقالی کی غرض سے جو سفر نامے لکھے گئے ہیں ان کو پڑھ کر قطعاً یہ تاثر پیدا نہیں ہوتا لیکن مجموعی طور پر یہ دور اردو میں سفر ناموں کے عروج کا دور ہے''۔(11)

اس صورت حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں سفر نامہ لکھنے کی رفتار تو خاصی تیز رہی لیکن سفر نامے کی تیکنک اور اس کے فن پر کوئی سنجیدہ کام نہیں ہو سکا۔ پاکستان میں سفر نامے کی اس کمزوری کا احساس اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کمزوری کو دور کرنے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں چند قدیم سفر ناموں کی تدوین ہوئی اور ان پر بھر پور مقدمے لکھے گئے، خصوصاً عجائبات فرنگ از یوسف کمبل پوش پر محمد کرام چغتائی اور تحسین فراقی کے مقدمے اس کوشش کی اچھی مثالیں ہیں، ان بھر پور مقدموں کے علاوہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مختصر سی کتاب'' اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ'' ابتدائی کوششوں کا بہترین نمونہ ہے، ان مضامین کے ذریعے سفر ناموں کی مذکورہ خامی کسی حد تک دور ہو جاتی ہے لیکن صرف چند مضامین اور مقدمات کسی صنف ادب کے فن اور اس کے حدود و امکانات کا تعین نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے کا پہلا مربوط اور مبسوط کام ڈاکٹر انور سدید نے انجام دیا، انھوں نے تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب دنیائے ادب کے سامنے پیش کی، اس کتاب میں سفر نامے کی تاریخ اور ادبی حیثیت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان گنت سفر نامے اس کتاب کی طویل فہرست میں شامل ہیں۔ ہندستان میں بھی ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے انیسویں صدی کے اردو سفر نامے پر تحقیقی کام انجام دیا ہے، انھیں اپنے اس مقالے پر دہلی یونی ورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ قدسیہ قریشی کا یہ کام بہت محدود اور انیسویں صدی کے بہت

کم سفرناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے کئی اہم سفرنامے اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر قدسیہ قریشی کا یہ کام سفرناموں کے حوالے سے ہندستان میں پہلا کام ہے، اس اعتبار سے یہ کام بہرحال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سفرنامے سے متعلق ان تحریروں میں اس صنف کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ اس کی تاریخی اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ آغاز، محرکات، ارتقائی عمل اور ع امتیازی خصائص کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز سفرنامے کی تعریف اور تکنیکی حیثیت سے تعین کی بھی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں سفرنامے کے موضوعات سے متعلق بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ نئے مباحث کا آغاز ہوا ہے۔ سفرنامے کو داستان، کہانی، خودنوشت اور رپورتاژ کے حوالے سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ لیکن ان ساری کوششوں میں نئے دور کی سائنسی ترقیات کی روشنی میں سفرنامے کو پرکھنے کی کوشش کا فقدان حیران کُن ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس علاقے، جس سماج اور جس بات سے واقف ہو جاتا ہے، اس سے ایک قسم کی ذہنی وابستگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ چناں چہ کسی اور ذریعے سے جب وہی بات اس کے سامنے آتی ہے تو اس میں خاص دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے دنیا کے کسی حصے یا کسی چیز کے بارے میں کہیں پڑھ لیا یا اسے دیکھ لیا ہے تو معلومات کے بعد وہی حصہ یا چیز جب دوبارہ اس کی نظر سے گزرتی ہے، یا اس سے متعلق گفتگو سنتا ہے یا کہیں پڑھتا ہے تو سابقہ معلومات کی روشنی میں فطری طور پر اس کی دلچسپی یکایک بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی سابقہ معلومات اور نئے علم میں کوئی فرق ہو تو تحقیق اور تجسس کے دروازے کھل جاتے ہیں اور انسان اس چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر استنباط نتائج کے بعد صحیح رائے قائم کر لیتا ہے۔ یہی اصول سفرنامے کی تحقیق اور تنقید پر بھی منطبق ہوتا ہے اسی اصول کے تحت ایک مقام کے مختلف سفرناموں میں بآسانی فرق کیا جا سکتا ہے۔

قدیم زمانے میں بیرونی دنیا کی معلومات حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس لیے سفرنامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حصول معلومات کا واحد قابل اعتبار ذریعہ تھا لیکن آج صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ آج ایسے بہت سے معقول

ذرائع ہیں جن کے وسیلے سے انسان کی معلومات میں ہر دم اضافہ ہوتا رہتا ہےاوراس کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ معلومات حاصل کرنے کےان ذریعوں میں ٹیلی ویژن کا نام سرفہرست ہے،آج ٹیلی ویژن ساری دنیا کوچشم زدن میں ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک کردیتا ہے،اورہم ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ٹیلی ویژن کی ایجاد نے سفرناموں کی اہمیت کوختم کردیا ہےاور کیا سفرناموں کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے؟ موجودہ معلومات کی روشنی میں ان سوالوں کے جوابات نفی میں ملتے ہیں،یعنی نہ تو ٹیلی ویژن کی وجہ سے سفرنامے کی اہمیت ختم ہوئی اور نہ اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع ہوئی بلکہ سفرناموں کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔

ٹیلی ویژن کی اپنی کچھ معذوریاں ہیں۔اس میں بہت ساری جزئیات اور کیفیات کونظرانداز کردیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا دائرۂ عمل وسیع ہوتے ہوئے بھی محدود ہے وہ تسلسل کی قوت سے محروم اور ہر فرد کی پسند و ناپسند کا تابع نہیں یعنی وہ فرد کے لیےنہیں افراداور سماج کے لیے ہے۔کسی ایک شخص کی ضرورت اور پسندیدگی سے اسے کوئی علاقہ نہیں،اس کے علاوہ ٹیلی ویژن کی فراہم کردہ معلومات کو یک جا کر کے دیکھنا بھی ہر شخص کی استطاعت سے باہر ہے۔اس اعتبار سے سفرنامے کی اہمیت اورافادیت مسلم ہے۔ بلکہ دن بہ دن اس کی اہمیت اورافادیت میں اضافہ ہورہا ہے۔سفرنامہ حصول معلومات کا ایک کم خرچ ذریعہ ہے۔ یہ ادب کی ایک ایسی صنف کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔جس نے قارئین کی توجہ کو بہت تیزی سے اپنی جانب مبذول کیا ہے۔

قدیم سفرنامہ کس مقام پر تھااور نیا سفرنامہ کس منزل میں ہے،اور دونوں کے درمیان کیا وصف امتیاز ہے۔ نئے سفرنامے کوقدیم سفرنامے سے کیوں مختلف ہونا چاہیےاور کس مقام پر کس طرح پہنچنا چاہیے۔ناقدین فن نے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ’’روایتی سفرنامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفرنامہ کیفیت سفر سے۔مقامات سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان ومکان کا اسیر ہوتا

ہے جب کہ کیفیات سفر قلم بند کرنے والا زمان ومکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے
اور یہی چیز اس کے سفرنامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا
رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے''۔(12)

سفرنامے کے تکنیکی اور فنی امکانات کا جائزہ کے لیے جب ہم پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم بیانیہ صنف نے اپنے طویل سفر کے دوران کئی روپ بدلے اور کئی منزلیں طے کی ہیں۔ روزنامچے اور خطوط لکھ کر واقعات کو محفوظ کرنے کا طریقہ سفرنامے میں ابتدا سے رائج ہے۔ شروع میں سفرنامے کا مقصد محض افادیت تھا اس میں ادبیت کی چاشنی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ دورِ جدید میں سفرنامہ نگار خارج یا ظاہر سے زیادہ داخل یا باطن میں سفر کرتا ہے یا وہ اپنے احساسات کو زبان دے کر سفرنامے کو فکشن کا ہم نوا بنا دیتا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے کہ اس دور میں جب کہ حصول معلومات کے لاتعداد ذرائع موجود ہیں سفرنامے کو صرف معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنائے رکھنا دانش مندی نہیں اس سے نہ ادب کی کوئی خدمت ہوسکتی ہے نہ سفرنامہ کی۔ اس لیے سفر نگار کو اپنے سفر کا ایسا مبصر ہونا چاہیے جس کی تحریر میں شگفتگی اور ادبی لطافت کے ساتھ تنقیدی بصیرت اور تخلیقی شعور ہو۔ اس بحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سفرنامہ جو دشوار و طویل راستے کی مسافت طے کرنے کے بعد اب اس مقام پر آ گیا ہے جہاں اس کی اپنی آواز، اپنا چہرہ اور اپنی پہچان ہے اور وہ دیگر نثری اصناف مثلاً داستان افسانہ، ڈرامہ، آپ بیتی یا رپورتاژ سے الگ صنف ادب کے طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ سفرنامے نے اپنے آپ کو ادب کی کسی نثری صنف کے حوالے نہیں کیا، دوسری اصناف نثر خصوصاً آپ بیتی اور رپورتاژ سفرنامے کے اسلوب و آہنگ سے قربت رکھتی ہیں اس لیے سفرنامے پر ان کے عکس کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے، مگر مجموعی طور پر سفرنامہ ایک سفرنامہ ہے۔ قدیم و جدید سفرناموں کے مقاصد، رجحانات، اسالیب اور رویوں میں خاصا فرق پیدا ہوا ہے۔ قدیم سفرنامہ نگار نئی زمین کی تلاش کا احوال، اجنبی دیس کے بازاروں کی رونق، تہذیب و معاشرت، رسم و رواج عجائب و غرائب، تاریخ و تمدن اور جغرافیائی کیفیات کی تفصیل رقم کرتا تھا ار پڑھنے والے اس تفصیل کے ذریعے گھروں میں بیٹھے بیٹھے سفرناموں کے معلوماتی

ذخیرے سے فیض یاب ہو جاتے تھے۔لیکن آج چوں کہ معلومات حاصل کرنے کے بے شمار ذرائع ہیں اور ساری تفصیل عام ہوگئی ہے۔ نئے سفرنامے کا انداز بدل گیا ہے۔آج کا سیاح اشیاء کا شمار اور تعارف کرانے کے بجائے ذاتی احساسات اور انفرادی ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔

حواشی

(1) مقدمہ عجائبات فرنگ از اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ مصنف خالد محمود، تحسین فراقی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیڈ یڈ نئی دہلی، ص 27,28

(2) سفر اور سیاحت میں فرق، وزیر آغا، از اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیڈ یڈ نئی دہلی، ص 18 تا 19

(3) مقدمہ رحمٰن مذنب از اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیڈ یڈ نئی دہلی، ص 20

(4) ڈاکٹر وحید قریشی تبصرہ، ''اے آب رود گنگا'' ۔ از رفیق ڈوگر ۔ معاصر 2، ص 599

(5) اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر مرزا احمد بیگ، ص 14

(6) اردو ادب میں سفرنامہ، انور سدید، ص 59

(7) سرزمین حافظ و خیام از مقبول درخشانی، پیش لفظ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص 8

(8) اوراق، لاہور، جنوری، فروری 1978، ص 27

(9) دیباچہ، موسموں کا عکس، ص 10، از اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 40

(10) ماہنامہ جامعہ، نہرو نمبر، دسمبر 1979، ص 103

(11) دیباچہ، عجائبات فرہنگ از یوسف خان کمبل پوش، ص 10، از اردو میں سفرنامہ کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ص 51

(12) دیباچہ، موسموں کا عکس، ص 10، از اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ص 57

دوسرا باب

اردو سفرنامے کا آغاز و ارتقا

سفرنامے کی ابتدا

قیاس کیا جاتا ہے کہ سفر پورا کر کے گھر واپس آنے والے مسافر، دوستوں اور رشتے داروں سے سفر کی روداد بیان کرتے ہوں گے۔ بعد میں اسی روداد نے سفرنامے کی شکل اختیار کر لی۔

چوں کہ ابتدا میں بحری سفر زیادہ کیا گیا اس لیے سب سے پہلے بحری سفر کے واقعات روز ناموں اور گائڈ بکس کی شکل میں لکھے گئے۔ ان کا مقصد دشوار گزار راستوں سے واقف کرانا سمتوں کا تعین اور سفر میں پیش آنے والے حالات حادثات سے نبرد آزما ہونے کے طریقوں کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ ان راستوں کے تعین کے لیے نقشے بھی ہوتے تھے۔ یہی روز نامچے اور گائڈ بکس سفرنامے کی بنیاد بنیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلا سفرنامہ کب اور کہاں تحریر کیا گیا۔ پھر بھی یورپین محققین یونانی سیاح ہیروڈوٹس (Hero Dotus) کو پہلا سفرنامہ نگار مانتے ہیں۔ مگر اس کے سفرنامے کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔

دنیا کا سب سے پہلا دریافت شدہ باقاعدہ سفرنامہ یونانی سیاح میگس تھینز کا تحریر کردہ INDICA (سفرنامۂ ہند) ہندستان کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے۔ میگس تھینز نے 330ق م میں ہندستان کا سفر کیا۔ اس وقت یہاں چندر گپت موریہ کی حکومت تھی جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا۔ تمام محققین اسے بے حد معلوماتی سفرنامہ قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے یہ اس عہد کا ایک مستند تاریخی ماخذ بن گیا ہے۔

چین کا راہب فاہیانؔ بدھ مت سے بہت متاثر تھا۔ وہ ہندستان آیا۔ اس کے سفر کا مقصد بدھ مت کے مقدس مقامات جیسے کپل وستو، پاٹلی پتر، ویشالی اور کُشی نگر کو دریافت کرنا، بدھ مت کی تعلیم حاصل کرنا اور بدھ مت کی کتابوں کی نقول حاصل کرنا تھا۔ مگر اس نے ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ''بدھ حکومت کے حالات'' تھا۔ اس میں

اس نے ہندستان کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات تفصیل سے درج کیے۔ یہ سفرنامہ بھی بہت مستند مانا جاتا ہے اور اکثر تاریخ نویسوں نے اس سے استفادہ کیا۔

اسی طرح ہیون سانگ بھی ایک چینی سیاح تھا۔ جس نے 630ء سے 645ء تک کا عرصہ ہندستان میں گزارا، اور پورے ہندستان کا دورہ کیا۔ ہیون سانگ کے سفرنامے کا موضوع مذہب اور تلاش حق ہے۔ مگر اس نے ہندستان کے معاشرتی حالات بھی بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں۔

سلیمان پہلا عرب تاجر ہے جس نے ہندستان کے ساحلی علاقوں کے طرزِ حکومت اور رہن سہن کا چین کے حالات وکوائف سے موازنہ کیا ہے۔ اس کا سفرنامہ 1845ء میں ''سلسلۃ التواریخ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اہم عرب سیاح ابوالحسن مسعودی قابل ذکر ہے۔ اس نے اپنی عمر کی پچیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ اس نے عراق، شام، روم، ایشیائے کوچک، افریقہ، تبت، لنکا اور ہندستان کا سفر کیا۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس کی سب سے اہم کتاب ''مروج الذہب ومعاون الجواہر'' ہے۔ جس میں اس نے اقوام عالم کی مختصر تاریخ وتعریف درج کی ہے۔ اسی دور میں اور بھی بہت سے سفرنامے لکھے گئے۔ مگر حکیم ناصر خسرو بلخی کا نام سفرنامہ نویسوں میں بہت اہم ہے۔ اس نے سات سال میں نو ہزار میل کی طویل مسافت اس زمانے میں طے کی جب سفر کرنا آسان نہ تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے ''زادالمسافرین'' کو شاعرانہ طرز نگاری سے بچا کر سادہ اور سلیس بیانیہ انداز میں پیش کیا۔

وسط ایشیا کے علاقے خوارزم میں ایک ایسا سیاح پیدا ہوا جس نے نہ صرف سیاحت بلکہ علم وفضل کی دنیا میں بھی تہلکہ مچا دیا۔ اس کا نام ابوریحان البیرونی تھا۔ البیرونی نے محمود غزنوی کے دور حکومت 998ء تا 1030ء میں ہندستان کا سفر کیا، اور اپنی گراں قدر تصنیف ''کتاب الہند'' سفر کی یادگار کے طور پر تخلیق کی۔ البیرونی سیاح کے ساتھ ساتھ ایک عظیم دانشور، فلسفی، جغرافیہ داں اور ریاضی ہیئت کا ماہر بھی تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندستان کے سماجی، علمی، مذہبی، طبقاتی اور معاشی حالات کا غیر جانب دارانہ احاطہ کیا ہے۔ اس کے مشاہدات میں بڑی گہرائی اور

وسعت ہے۔ وہ ہر چیز کا ذکر تفصیل سے کرنا پسند کرتا ہے۔ وہ خطیب اور معلم کی طرح اپنی بات منطقی استدلال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے سفر نامے کا اسلوب بیانیہ کے بجائے خطیبانہ ہو گیا ہے۔

اب ہمارے سامنے ایک ایسے عظیم سیاح و سفر نامہ نویس کا نام آتا ہے جس کے ذکر کے بغیر سیاحت اور سفر نامے کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ مراقش کی اس عظیم شخصیت کا نام شیخ ابوعبداللہ معروف بہ ابن بطوطہ تھا۔ یہ سیاحت کی غرض سے عین جوانی کے زمانے یعنی 1325ء میں گھر سے نکلا اور یمن، حجاز، مصر، شام، عراق، ترکی، ایران، بخارا، افغانستان، بدخشاں اور ہندستان کی سیر کرتا ہوا چھبیس سال بعد اپنے گھر پہنچا۔

ابن بطوطہ کے سفر نامے سے ہندستانی تاریخ اور جغرافیہ کے ایسے نئے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے تھے۔ لیکن یہ سفر نامہ اس نے خود تحریر نہیں کیا بلکہ جب وہ اپنے وطن مراقش پہنچا تو سلطان ابوعنان کو اپنے سفر کے احوال سنائے۔ محمد بن محمد جزالکلبی نے جب اس کے تمام احوال سنے تو ایک سفر نامہ مرتب کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفری واقعات بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ جمع کیے تھے۔ ابن بطوطہ کا یہ سفر نامہ ''عجائب الاسفار'' تاریخ انسانی کی ان گمشدہ کڑیوں کی نشان دہی کرتا ہے جو عرصۂ دراز تک نگاہوں سے اوجھل تھیں۔ یہ جہاں تحیر کن واقعات کا خزینہ ہے وہیں زبان وادب کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اس میں داستانوں جیسی تحیر خیزی اور ناولوں جیسی ادبیت جگہ جگہ موجود ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے آتے آتے ہندستان یورپ میں سونے کے چڑیا کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا اور یوروپی اقوام اس ملک کے سفر کی طرف مائل ہو رہی تھیں۔ ہندستان آنے والے پہلے یوروپی سیاح کا نام مارکو پولو تھا۔ جو 1265ء میں ہندستان آیا۔ اس نے اپنے تجربات ومشاہدات کو نہایت مربوط انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اس سفر نامے کو دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یوروپی سیاحوں میں فرانس کے ڈاکٹر برنیر کو کافی شہرت حاصل ہے۔ یہ 1656ء سے 1668ء تک ہندستان میں مقیم رہا۔ اس نے ایک سفر نامہ مرتب کیا۔ اس سفر نامے کا پہلا اردو ترجمہ ''وقائع سیر و سیاحت''

1888ء میں مرادآباد سے شائع ہوا۔ برنیر کا سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ عہد عالم گیر کے سیاسی حالات کا عینی شاہد ہے مگر جب وہ اپنے تاثرات واحساسات بیان کرتا ہے۔تو ایک متعصب اور جانب دار مورخ معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کے چند مشہور و مستند سفرناموں کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ انسان فطرتاً مہم جواور سفر پسند واقع ہوا ہے۔وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔شوق سیاحت اس کی طبیعت کا خاصہ ہے،سفر میں آرام وآسائش کے فقدان اور رسل ورسائل کی کمی کے باوجود وہ اپنی جستجو اور خواہش کو نہیں دبا سکا۔ ساری مشکلات برداشت کیں، مصائب جھیلے پریشانیں اٹھائیں، مگار پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آنے دی، بادمخالف، اسپ شوق کو تازیانہ ثابت ہوئی۔جب ایک بار قدم آگے بڑھا تو بڑھتا ہی چلا گیا، پیچھے ہٹنا تو کجا،ٹھہرنے کا بھی نام نہ لیا۔

حالاں کہ قدیم زمانے میں سفر اتنا دشوار تھا کہ قدم قدم پر حادثات کا خطرہ درپیش رہتا۔سفر اگر خشکی کی راہ سے ہُوا تو جنگلی جانوروں کے علاوہ لٹیروں کا خطرہ موجود تھا۔سمندری سفر میں طوفان کے علاوہ بحری قزاق جگہ جگہ منڈلاتے رہتے مگران تمام رکاوٹوں کے باوجود انسان جہاں گشتی اور جہاں گردی سے باز نہ آیا اگر وہ مختلف خدشات لیے گھر مین بیٹھا رہتا تو اقوام عالم کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور علوم وفنون سے دنیا کبھی واقف نہ ہوتی۔جغرافیہ اور تاریخ کا علم بھی تشنہ تکمیل رہ جاتا۔

عہد قدیم میں سیاحت اگر دشوار تھی تو سیاحوں کی قدرومنزلت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ ہر شخص انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا اوران کی خاطر مدارات کرنے کی کوشش کرتا۔سیاح کو ایک عام آدمی سے زیادہ عالم، فاضل اور معلومات کا خزانہ رکھنے والا انسان سمجھا جاتا اور یہی کچھ غلط بھی نہ تھا۔قدیم زمانے کے بیشتر سیاحوں میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو ایک جہاں دیدہ اور عالم و فاضل انسان میں ہونی چاہیے۔سیاح کا احترام صرف عوام تک ہی محدود نہ تھا حاکم ، رئیس، وزیر، امیر سبھی اس کی قدر کرتے۔ وہ جس ملک میں پہنچتا اس کا شاندار استقبال کیا جاتا،

حکمراں اسے اپنے قریب نشست دے کر عزت افزائی کرتے۔ اسے تحفے تحائف ور انعام واکرام سے نوازا جاتا۔ کبھی کبھی جاہ ومنصب بھی عطا ہوتے۔ مارکوپولو، ابن جبیرا اور ابن بطوطہ ہندستان کی سیاحت کے دوران بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ حکمرانوں نے جی کھول کران کی پذیرائی کی اور نوازشات میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک سیاح جس طرح دیارِ غیر میں عزت پاتا ہے اسی طرح واپسی پر اہلِ وطن بھی اسے فخر کی نگاہوں سے دیکھتے اور اس کی قدر ومنزلت کرتے ہیں۔

قدیم سفرنامہ نئی دینا کو دیکھنے اور تجربات ومشاہدات کو لباس تحریر میں لانے کے مقصد سے بندھا ہوا تھا۔ سیاحوں کی کوشش یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔ سیاح کے حق میں سفر وسیلہ ظفر بھی تھا۔ یہ کامیابی اسے عزت واحترام، انعام واکرام، جاہ ومنصب اور عزیزوں اور ہم چشموں میں توقیر کی صورت میں ملتی تھی۔ سیاح دنیا کو اپنی نظر سے دیکھ کر فخر ومسرت کے جذبات سے سرشار ہوجاتا۔ قدیم سیاحوں نے عموماً خارجی تجربات و مشاہدات سے سروکار رکھا ہے اور واقعات پر رائے زنی یا تنقید وتبصرے سے گریز کیا ہے۔ بالفاظ دیگر قدیم سیاح جو کچھ دیکھتا بے کم وکاست بیان کر دیتا اور اس کی ذمیداری ختم ہو جاتی۔ وہ قاری اور واقعات کے درمیان دخل در معقولات کا مرتکب نہیں ہوتا۔ واقعات میں حسن اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جس ادبی چاشنی کی ضرورت ہوتی ہے عام سفرناموں کا انداز بیانیہ ہے، زبان وبیان سادہ، سلیس اور اسلوب دلچسپ اور جاذب توجہ ہے، بعض مقامات پر مُرَصَّع سازی کی کوشش کے نمونے بھی ملتے ہیں، مجموعی طور پر قدیم سفرنامے عہد گزشتہ کی علمی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا مستند اور معتبر ذریعہ ہیں۔

اردو سفرنامے کی ابتدا اور ارتقاء

سفرنامے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عہد قدیم کا ہندستان دوسرے ملکوں کے بادشاہوں اور تاجروں کے لیے ''سونے کی چڑیا'' اور سیاحوں کے لیے طلسماتی سرزمین تھا، اس کشش نے یونان و

چین، ایران وعرب اور مغربی ایشیا سے مشرقی یورپ تک ہر ملک کے سیاحوں کو اپنی جانب مائل کر لیا تھا۔ ہندستان میں اردو کا چلن دیکھ کر حکومت کے کاموں میں تعاون دینے والے انگریز کارکنوں اور افسروں کو اردو سکھانے اور تربیت دینے کی غرض سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ کالج بالواسطہ طور پر اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو نثر کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے بہت سے مواقع فراہم کیے۔ خوش بختی سے اس کالج کے روح رواں ڈاکٹر جان گل کرسٹ اردو سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ اس ادارہ میں بڑے پیمانے پر داستانوں کے ترجموں کا کام ہوا۔ اور دوسری زبانوں کی بہت سی داستانیں اردو میں منتقل کی گئیں، ان سفری داستانوں میں سفر کے تمام تام جھام موجود تھے۔ میر امّن کی ''باغ و بہار'' میں چار درویش اپنے سفر کا احوال بیان کرتے ہیں۔ حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' میں حاتم طائی کی سات سیاحتوں کا حال ہے۔ خلیل خاں اشک کی ''داستان امیر حمزہ'' مافوق الفطرت عناصر کی محیر العقول سفری داستانوں کو سامنے لاتی ہے، یہاں تک کہ نہال چند لاہوری کی ''مذہب عشق'' میں بھی گل بکاؤلی کی تلاش میں شہزادے کے ایک طویل سفر کا بیانیہ ہے۔

یہاں فورٹ ولیم کالج کے نثری کارناموں کو کھینچ تان کر سفر نامہ قرار دینا منشا نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا بھر کی داستانوں نے جس طرح سیاحوں کے سفری احوال سے کسب فیض کیا ہے اسی طرح اردو سفر نامہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی ان داستانوں میں نظر آتے ہیں جو فورٹ ولیم کالج میں تصنیف ہوئیں یا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ حالاں کہ یہ کتابیں محض خیالی یا قوت متخیلہ کے دوش پر کیے گئے سفر کی روداد سناتی ہیں اور وہ بھی زبان غیر سے یعنی ترجمے کے ذریعے، اس لیے کسی براہ راست اردو سفر نامے سے ان کا کوئی علاقہ نہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اردو سفر نامے کا خاکہ بنانے، راستہ ہموار کرنے اور اردو سفر نامہ نگار کا ذہن تیار کرنے میں ان تصنیفات کا بڑا ہاتھ ہے، انہی کارناموں سے حوصلہ پا کر اردو میں سفر نامہ نگاری کا آغاز ہوا۔

اردو نثر نے اٹھارہویں صدی میں کافی ترقی کی مگر صدی کی ابتدا میں فارسی کا اتنا غلبہ تھا کہ اردو میں نثر لکھنے کا

خیال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چناں چہ ابتدائی سفرنامے بھی فارسی میں ہی لکھے گئے جیسے شیخ اعتصام الدین اور مرزا ابوطالب اصفہانی کے سفرنامے، بعد میں ان میں سے اکثر کا ترجمہ اردو میں ہوا۔

ہندوستان میں انگریزوں کا زور بڑھنے کے ساتھ ساتھ برطانوی اور دوسرے یورپی ممالک کے قصے کہانیاں یہاں کے لوگوں تک زیادہ پہنچنے لگیں، اور لوگوں کے دلوں میں ان ممالک کے سفر کا شوق بڑھنے لگا۔ لہذا ابتدائی اردو اور فارسی سفرنامے لندن اور مغربی ممالک کے سفر پر مشتمل ہیں۔

اب تک کے باقاعدہ اردو سفرناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ جس میں اولیت کا شرف یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے ''تاریخ یوسفی'' معروف بہ ''عجائبات فرنگ'' کو حاصل ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش نے 1837ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ یہ سفرنامہ اسی سفر کی روداد ہے۔

عجائبات فرنگ کی یہی خوبی نہیں کہ وہ اردو کا پہلا سفرنامہ ہے بلکہ زبان و بیان کی صفائی، بے ساختگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بھی اس کی اہمیت ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام 1847ء میں دہلی سے شائع ہوا پھر تحسین فراقی نے دوبارہ ترتیب دے کر 1983ء میں لاہور سے شائع کیا۔

کمبل پوش کا اصلی وطن حیدرآباد تھا۔ مگر وہ 1828ء میں وہ لکھنو آ کر بس گئے تھے۔ وہاں وہ نصیرالدین حیدر کے دربار سے وابستہ تھے اور نواب سے اجازت لے کر اس سفر پر روانہ ہوئے۔ کمبل پوش انگلستان کی ہر چیز سے بہت زیادہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ اسے ہو بہو بیان کر دیتے ہیں، واقعات کا انتخاب نہیں کرتے، یہ صداقت اور حقیقت نگاری اس سفرنامے کو اہم بنا دیتی ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے ''عجائبات فرنگ'' ایک بیانیہ ہے جس کی نثر کہیں سادہ اور کہیں رنگین ہے۔ اس میں سلاست زیادہ ہے کہیں کہیں مقفیٰ و مسجع زبان استعمال کی ہے۔ ضرب الامثال اور محاوروں کا بہت اچھا استعمال کیا گیا ہے۔

اردو کے قدیم سفرناموں میں نواب کریم خان کا ''سیاحت نامہ'' بھی کافی اہم ہے۔ کریم خاں کمبل پوش کے ہم عصر تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے جھجھر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں لندن گئے، اور

دسمبر 1840ء سے نومبر 1841ء تک وہاں مقیم رہے۔ کریم خاں جھجھر کے نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دوران سفر یا دوران قیام انگلستان وہ جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے اسے روزانہ باقاعدگی کے ساتھ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے اس لیے اس کے بیان کی صداقت مسلّم ہے۔ بنیادی طور پر ''سیاحت نامہ'' لندن کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی ایک معتبر دستاویز ہے۔ کریم خاں صرف واقعات و تاثرات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ اپنا ردعمل بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ ان میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہے۔ وہ مشرق و مغرب کا موازنہ بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں، اور قاری کو پوری طرح اپنے مشاہدات و تجربات میں شریک کر لیتے ہیں۔

مولوی مسیح الدین علوی کا ''سفرنامہ''، ''تاریخ انگلستان'' معروف بہ سفرنامہ لندن بھی کافی مشہور و معروف سفرنامہ ہے۔ 1856ء میں برطانوی سرکار نے جب اودھ کی حکومت کو معزول کیا تو واجد علی شاہ مولوی مسیح الدین علوی کو دادرسی کے لیے سفیر بنا کر اپنی والدہ، بھائی اور ولی عہد کے ساتھ انگلستان روانہ کیا۔ 18 جون 1856ء کو 140 افراد پر مشتمل ایک قافلہ لندن کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی اور کچھ عرصے کے بعد مولوی مسیح الدین کو واجد علی شاہ نے اپنی سفارت سے برطرف کر دیا۔ مگر علوی نے کم و بیش سات سال لندن میں قیام کیا۔ اس دوران انھیں لندن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں غدر کے اسباب باغیوں کی شرارتوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ظلم و مظالم کو بڑے حقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی تہذیب و تمدن ''معیشت و معاشرت''، تعلیم، صنعت، فن تعمیر اور دوسرے جدید فنون کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

سرسید کے عہد میں اردو ادب نے بہت ترقی کی ان کے رفقاء نے اردو کو مختلف اصناف سے مالا مال کیا۔ اس عہد میں کئی اچھے سفرنامے بھی لکھے گئے۔ سرسید کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' انھیں میں سے ایک ہے۔ سرسید کے سفر لندن کا مقصد علم و ہنر اور علم و فنون کی نئی راہوں کا تلاش تھا۔ سرسید نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ قوم کی

ترقی کا راز نئی تعلیم میں پوشیدہ ہے۔لہذا ولایت جانے کا ان کا بنیادی مقصد وہاں کے طریقہ تعلیم، نصاب تعلیم، اصول، درس وتدریس اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے براہِ راست واقفیت اور معلومات حاصل کرنا تھا۔تاکہ ان سے اپنے ہم وطنوں کو مستفید کرسکیں۔

سرسید کے اس سفر کا ایک مقصد سر ولیم جیوری کی کتاب ''لائف آف محمدﷺ'' کا جواب لکھنا بھی تھا۔کتاب کا مدلل جواب لکھنے کے لیے وہ برٹش میوزم لائبریری میں کچھ چیزیں دیکھنا چاہتے تھے۔ولایت میں رہ کر انھوں نے دونوں مقاصد کیے۔سرسید کی لندن کی ترقی، خوش حالی، نظم وضبط اور تعلیم وتربیت دیکھ کر خوش ضرور ہوتے ہیں۔مگر دوسرے ہی لمحے اپنے ملک کی بدحالی پسماندگی، جہالت وافلاس کا خیال کرکے رنجیدہ بھی ہوجاتے ہیں۔انھوں نے اپنے سفرنامے میں اکثر اپنی قوم کی پستی اور انگریزوں کی ترقی کا موازنہ کیا ہے۔اور شاید اسی وجہ سے ان کے لہجہ میں سوز وگداز جھنجھلاہٹ اور کہیں کہیں تکرار پیدا ہوگئی ہے۔ان کے اسلوب میں خطابت کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست بھی پائی جاتی ہے۔

سرسید نے اپنے اس سفر کا آغاز 1869ء میں کیا۔ڈیڑھ سال وہاں قیام کرنے کے بعد واپس آئے۔ مسافران لندن ایک ایسے مخلص شخص کا سفرنامہ ہے جس نے اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے سفر کی پریشانیاں برداشت کی ہیں۔اس کا نام سرسید نے خود ''مسافران لندن'' تجویز کیا تھا۔مگر یہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکا۔ اسے محمد اسماعیل پانی پتی نے بعد میں ترتیب دیا اور مجلس ترقی ادب لاہور نے پہلی بار 1961ء میں شائع کیا۔

مرزا اثار علی بیگ کا ''سفرنامہ یورپ'' سرسید کے عہد کا بہت ہی اہم سفرنامہ ہے۔انھوں نے 1885ء میں لندن کا سفر کیا اور وہاں تین مہینے مقیم رہے۔سفر کے دوران انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے روزنامچے کی شکل میں تاریخ وار درج کرلیا اور اسی کی بنیاد پر اپنا سفرنامہ لکھا۔انھوں نے ایک محقق اور ناقد کی حیثیت سے لندن کو دیکھا۔ان کے سفر کا مقصد سیر وسیاحت، کرم فرماؤں اور مربیوں سے ملاقاتیں اور تعلیمی معلومات حاصل کرنا تھا۔مرزا اثار علی ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔چناں چہ انھوں نے انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو بغور دیکھا۔لندن میں

اپنے سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا بغور جائزہ لے کر ہندستان سے موازنہ کر کے نتائج بھی اخذ کیے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے یورپ کے رسم ورواج، عادات واطوار، معاشرت، طریقۂ تعلیم، عمارتوں، گلی کوچوں، سڑکوں، پارکوں اور موسموں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اسلوب قدیم مگر زبان سادہ اور رواں ہے۔

نواب رام پور محمد حامد علی خاں کا سفرنامہ ''سیر حامدی'' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ انھوں نے کئی ملکوں کا سفر کیا۔ مارچ 1883ء میں انھوں نے اپنا سفر شروع کیا اور جنوری 1884ء کو جاپان ہوائی، فرانس، جرمنی، یونان، امریکہ، افریقہ اور مصر کی سیاحت واپس لوٹے۔ وہ سر آکلینڈ کلون لیفٹنٹ گورنر ممالک مغربی کی دعوت پر سفر پر نکلے تھے۔ گو کہ وہ اپنے مرتبے کی وجہ سے آداب شاہی کے پابند تھے پھر بھی انھوں نے مختلف ممالک کی تہذیبوں کو بغور دیکھا، طرز معاشرت کا تجزیہ بھی کیا۔

نواب حامد علی خاں کے یہ سفرنامہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں لکھا گیا۔ اس کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں ایشیاء اور امریکہ کے سفرحالات ہیں دوسری میں یووپ اور مصر کے۔ یہ سفرنامہ 1896ء میں نواب صاحب کے استاد مولوی فرخی نے آگرہ سے شائع کرایا۔

علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ واپس آنے پر دوستوں کے اصرار پر حالات سفر تحریر کیے اس طرح اردو ادب میں ایک وقیع سفرنامے ''سفرنامہ روم مصروشام'' کا اضافہ ہوا۔

شبلی کے اس سفر کا مقصد محدود تھا۔ غیر مسلم مورخین کی متعصّبانہ اور تنگ نظر روش کی وجہ سے وہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ رخ بھی دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے جسے یوروپین تاریخ نگار جان بوجھ کر نظر انداز کرتے تھے۔ اس خیال کے تحت انھوں نے اسلام کی جلیل القدر ہستیوں کی سوانح حیات لکھنا شروع کی۔ اس سلسلے میں ضروری ماخذات تک رسائی کے لیے انھوں نے اس سفر کا ارادہ کیا۔

شبلی نے اس سفر میں عملی کاموں کی طرف زیادہ توجہ دی۔ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور قاہرہ میں ہر

قابل ذکر مدرسہ، دارالاقامہ، کتب خانہ، سررشتہ، تعلیم اور درس وتدریس کا بغور جائزہ لیا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ شہر کے عام حالات، مشہور عمارات، قابل دید مقامات کے بارے میں بھی لکھا۔مشہور اخبارات ورسائل کا تجزیہ بھی کیا۔ بادشاہوں، صاحب اقتدار حضرات سے بھی ملے اور عربوں وترکوں کے اخلاق وعادات وآداب کے بارے میں تفصیلات حاصل کیں۔انھوں نے سفر کے حالات بھی تفصیل سے بیان کیے۔جس منظر کو دیکھا اس کی جملہ تفصیلات ذہن نشین کرلیں۔اسی خوبی نے ان کے سفرنامے کو معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بنادیا۔سفر کے اپنے مقصد میں بھی شبلی کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے ترکی، مصری اور شامی کتب خانوں نے اہم مواد حاصل کیا۔

شبلی کے سفرنامے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں اس طرح بیان کرجاتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں اتر جاتی ہیں۔یہ ان کی نثر کی بھی خوبی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے دو سفرنامے تحریر کیے۔پہلا ''وسط ایشیاء کی سیر'' اور دوسرا ''سیرِ ایران'' ہے۔یہ دونوں سفرنامے مولانا کی وفات کے بعد دو اصحاب نے ان کے روزنامچوں اور وقتاً فوقتاً نوٹ کی گئی یادداشتوں کی بنیاد پر مرتب کیے۔

1865ء میں مولانا نے وسط ایشیا کا سفر کیا۔یہ سفر سیاسی نوعیت کا تھا۔وہ ایک سرکاری وفد کے ساتھ ایشیاء گئے جسے سرکار نے وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔یہ سفرنامہ آغا محمد اشرف نے مرتب کیا۔

ان کا دوسرا سفرنامہ آغا محمد طاہر نے منتشر یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیا۔یہ صرف 192 صفحات پر مشتمل ہے۔وسط ایشیاء کے سفر سے واپس آنے کے بعد وہ ایران کا سفر اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ فارسی زبان کی ایک لغت تیار کریں۔اس کے علاوہ وہ ایران سے کتابیں بھی لانا چاہتے تھے۔

مولانا دس ماہ کی ایرانی سیاحت کے بعد 24 جولائی 1886ء کو وہ لاہور واپس آئے تو احباب نے رودادِ سفر سننے کی خواہش ظاہر کی۔اس روداد کو کئی اخبارات ورسائل نے شائع کیا۔یہاں تک کہ گورنر پنجاب آئی۔آر ڈی اسمتھ نے اس سفر کے تمام حالات وواقعات بہ تفصیل شائع کرنے کی درخواست کی تاکہ ہندستانی عوام کی معلومات میں اضافہ ہو۔

علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ انھوں نے موسموں کے حال، سمندر، میدا، پہاڑ جنگل شہر اور دیہات کے لوگوں کی مزاجی کیفیت اور حاکموں کے رویوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

1857 کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد ہندستان پر پوری طرح انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندستانیوں پر جی کھول کر مظالم ڈھائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفرنامہ ''تواریخ عجیب'' موسوم بہ'' کالا پانی'' انگریزوں کے اسی ظلم وستم کی ایک دستاویز ہے۔

مولوی جعفر موضع تھانیسری ضلع انبالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ دوران جدوجہد آزادی ان کا گھر مجاہدین کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھا۔ سرحد کو روپیہ، اسلحہ اور تازہ دم سپاہ انھیں کے توسط سے جاتے اور راز دارانہ خط وکتابت بھی انھیں ذریعے ہوتی۔ اپنے وطن کی انھیں خدمات کا انھیں ملزم ٹھہرایا گیا اور کالا پانی کی سزا ہوگئی۔ انھوں نے تکلیف دہ اٹھارہ سال انڈمان میں گزارے۔ یہ سفرنامہ خود نوشت سوانح کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک طرف برطانوی ظلم وستم کا پردہ فاش کرتا ہے تو دوسری جزائر انڈمان کی زندگی کے نشیب وفراز سے بھی واقف کراتا ہے۔ اس کے مطالعے سے انگریزوں کی ذہنیت، طرز وفکر، ہندستانیوں کے تئیں ان کے تعصّبات اور اذیت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

جزرائر انڈمان کی پیداوار، آب وہوا، جنگلات، پہاڑ اور وہاں کی معاشرت پر انھوں نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

غرض یہ کہ اردو سفرنامے میں انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جس سفر کی ابتداء کی تھی صدی کے اختتام تک یہ روایت خاصی مستحکم ہوگئی۔ مذکورہ بالا جن سفرناموں کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ اور بہت سے سفرنامے ہیں۔ مگر اسے مختصر سے جائزے میں سب کا بیان ممکن نہیں۔

انیسویں صدی کے اہم سفرنامے

1857ء کے بعد ہندستان پر انگریزوں کی حکومت مستحکم ہوگئی تھی اور ہندستان کے باشندے اپنے آقاؤں کے دیس انگلستان کی تعریف وتوصیف سن کر ان کے علمی خزانوں سے براہِ راست استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔

بعض اصلاح پسند افراد نے ہندستانیوں کے علمی افلاس کو مغربی تعلیمات کے وسیلے سے دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انھیں انگلستان لے گئی اور انھوں نے اپنے سفری تجربات اور مشاہدات کو سفرناموں کی شکل میں ملک وقوم کے سامنے پیش کیا۔ اس عہد میں اردو نثر ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو کے علمی اور ادبی خزانے کو مالا مال کر دیا تھا۔ مختلف موضوعات پر مبسوط کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ سرسید اور ان کی اصلاحی تحریک کے علاوہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج نے بھی اردو کے نثری خزانوں میں قابل قدر اضافہ کر دیا تھا۔ اخبارات ورسائل بھی اردو کی خدمت میں پیش پیش تھے۔ سنجیدہ موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین اخبارات ورسائل میں برابر شائع ہو رہے تھے۔ سرسید نے جس علمی روشنی کو عوام تک پہنچانے کی کوشش شروع کی تھی کچھ عرصے کی کشمکش اور ردّوقبول کے کے بعد عوام بھی اس میں دل چسپی لینے لگے تھے۔

اسی زمانے میں سیر سید، شبلی اور محمد حسین آزاد نے علی الترتیب لندن، روم ومصروشام اور ایران کے سفر کیے اور اپنے تجربات ومشاہدات کو روزنامچوں کی شکل میں محفوظ کیا۔ بعد میں انھیں روزنامچون کے ذریعے سفرناموں کی تکمیل ہوئی، اور نہایت خلوص ومحنت کے ساتھ اس جدوجہد کو آگے بڑھایا۔ تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے بیرونی ملک کے تعلمی نظام سے استفادہ کرنے کی کوششوں کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ اسی کے ساتھ سفر اور سفرنامے کی روایت کو بھی فروغ ہوا۔ اردو کے روایتی سفرناموں کی فہرست میں جس سفرنامے کو سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی وہ مولانا شبلی نعمانی کا ''سفرنامہ روم ومصروشام'' ہے مولانا کا یہ سفر ایک خالص علمی نوعیت کا سفر تھا، جس میں انھوں نے اسلامی دنیا کے طور طریق علوم وافکار، بود وباش، طرزِ معاشرت اور تہذیب وتمدن سے کہیں زیادہ علمی دنیا کا مطالعہ کیا۔ کتب خانوں اور درسگاہوں کی سیر کی، علماء سے ملاقاتیں ہوئیں، عجائب گھروں، اخبار کے دفتروں اور مختلف النوع قسم کی انجمنوں کو قریب سے دیکھا مولانا شبلی ایک بے مثل محقق، مورخ، ادیب، شاعر، زبان دان اور انشاپرداز تھے وہ اردو کے علاوہ عربی، فارسی کے بھی جید عالم تھے۔

مولانا شبلی کے علاوہ انیسویں صدی میں کچھ اور بھی اچھے سفرنامے لکھے گئے مثلاً رام پور کے نواب حامد علی

خاں کا سفر نامہ ''مسیرِ حامدی'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس مین کم وبیش ساری دنیا کے سفر کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ نواب حامد علی خاں نے پورے دس ماہ تک جاپان، امریکہ، انگلستان اور مصر وغیرہ کی سیاحت کی۔ان کے سفر نامے کی ایک کمزوری یہ ہے کہ نواب ہونے کی وجہ سے ان کا ٹھاٹ باٹ ساتھ چلتا رہا اور وہ سفر کی دشواریوں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے سفر کو پوری طور پر محسوس کرنے سے قاصر رہے۔ چناں چہ سیاحت کو یادگار بنانے والے حالات واقعات، لطف اندوز کرنے والے مناظر اور عوامی زندگی کے شعبون سے تعلق رکھنے والے مشاغل سے یہ سفر نامہ خالی ہے۔ ''مسیرِ حامدی'' میں نواب صاحب مناظر کو دور کھڑے ہوکر ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔خود مناظر کا حصہ نہیں بنتے اس کے برعکس مولوی عبدالرحمٰن امرتسری عوام کے درمیان سے گزرتے ہیں اور مناظر و واقعات کو قریب سے دیکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو مناظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ڈائریوں کی شکل میں لکھے گئے اردو کے قدیم سفر ناموں میں نواب کریم خاں کے ''سیاحت نامے'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔جس کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے مرتب کر کے ایک طویل مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع کیا ہے۔نواب کریم خاں اردو کے اولین سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش کے ہم عصر تھے انھوں نے مارچ 1840ء میں انگلستان کا سفر کیا اور یکم دسمبر 1804ء سے نومبر 1841ء تک لندن میں مقیم رہے اس طرح کم وبیش ایک سال لندن میں گزار کر واپس آئے۔نواب کریم خان نے یہ سفر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے جھجھر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔نواب کریم خان جھجھر کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔نواب کریم خان جو کچھ دیکھتے ہر روز باقاعدگی سے اپنی ڈائری میں درج کر لیتے۔اس طرح ''سیاحت نامہ'' لندن کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ایک ایسی دستاویز ہے جس میں اس دور کے لندن کی قلمی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

3 نومبر 1839ء کو انگریزوں نے کابل پر چڑھائی کی، اس جنگی مہم میں انگریزی فوج کے ایک جمعدار کی حیثیت سے فدا حسین بھی شامل تھا۔فدا حسین نے اس سفر میں فوجی مقاصد کے علاوہ گرد وپیش کے مناظر اور واقعات

پر بھی نظر رکھی اور میرٹھ سے غزنی کی آمد و رفت کی روداد سفر روزنامچے کی شکل میں تحریر کی ہے۔ فدا حسین ایک سپاہی تھا۔ قدیم داستانی انداز کا یہی سفر نامہ اس لحاظ سے قدر و منزلت کا حامل ہے کہ اس زمانے میں باستثنائے ''تاریخ یوسفی'' اردو میں کوئی سفر نامہ نہیں ملتا، اس لیے اگر تاریخ یوسفی انگلستان کا پہلا سفر نامہ ہے تو اندرون ملک کے سفر ناموں میں ''تاریخ افغانستان'' ہی اولین سفر نامہ قرار پاتا ہے حالاں کہ کہا جاسکتا ہے کہ یوسف خان کمبل پوش نے انگلستان سے واپسی پر ہندستان کے کئی شہروں کا سفر کیا اور اپنے سفرنامے میں ان کے تفصیلی واقعات قلم بند کیے ہیں۔ لیکن اس دلیل کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''تاریخ یوسفی'' بنیادی طور پر انگلستان کا سفر نامہ ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ''عجائبات فرنگ'' سے ظاہر ہے۔ اندرون ملک ''تاریخ افغانستان'' ہی پہلا باقاعدہ سفر نامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ''تاریخ یوسفی'' کے سامنے ''تاریخ افغانستان'' کا چراغ نہیں جلا اور وہ ایک جنگی وقائع نگار کی خام و ثقیل نثر کا نمونہ بن کر رہ گیا یہ سفر نامہ تاریخ افغانستان کے نام سے 1852ء میں تحریر ہوا۔

اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ'' کے صفحہ 38 پر مرزا حامد بیگ سفر فرنگ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اردو کا تیسرا قدیم ترین سفر نامہ ''سفر فرنگ'' ہے' از میرزا ابو طالب خان اصفہان (آغاز سفر 1856ء) ہندستانی مزاج لیے ہوئے ہے''۔(1)

ڈاکٹر انور سدید اپنے ضخیم مقالے ''اردو ادب میں سفر نامہ'' کے صفحہ 107 پر رقم طراز ہیں:

> '' میرزا ابو طالب خان نے جو عوام میں لندنی مشہور ہوئے 1799ء میں لندن کا سفر اختیار کیا اور 1801ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ان کا سفر نامہ ''سیر طالبی'' لندن کا آنکھوں دیکھا حال پیش کرتا ہے۔ ابو طالب نے قیام لندن کے دوران انگریزی تہذیب و تمدن کا گہرا مطالعہ کیا تھا، یہ سفر نامہ انگریزی تہذیب کے محاسن و معائب کو بڑی خوبی سے سامنے لاتا ہے او رہندستانی سفر ناموں کے اہم صحیفوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس سفر نامے کی زبان بھی فارسی ہے جو اس دور کی تہذیبی زبان شمار ہوتی تھی''۔(2)

مولوی مسیح الدین علوی کا سفر نامہ تاریخ انگلستان (سفیر اودھ) اس اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں سفر نامے کی روایت غیر مستحکم تھی۔ انگلستان کی جانب سفر کرنے والے جس قدر کم تھے، سفر نامہ لکھنے والے ان سے بھی کم تھے، دوسری اہمیت یہ ہے کہ مسیح الدین علوی نے لندن میں کم و بیش ساڑھے ساتھ برس کا طویل عرصہ گزارا جو ان سے پیشتر کسی اور ہندستانی نے نہیں گزارا تھا۔ کم و بیش ساڑھے سات برس لندن میں قیام کی وجہ سے مولوی مسیح الدین کو لندن کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا بہترین موقع ملا، ان کا سفر نوعیت کے اعتبار سے خالص سیاسی سفر تھا۔ اس لیے ابتدا میں تو وہ مقصد کی ڈور سے بندھے رہے لیکن سفارت سے سبکدوش ہونے کے بعد بے شمار مشاہدات کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کیا، انھوں نے اپنے سفر نامے میں غدر کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، باغیوں کی شرارتیں اور انگریزوں کے ظلم و ستم کو حقیقی پیرایہ اظہار میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی تہذیب و تمدن ''معیشت و معاشرت، تعلیم و تعلم، صنعت و حرفت، فن تعمیر، نیز دیگر فنون جدید کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے۔

تاریخ انگلستان، بڑے سائز کے 1537ء صفحات مقدمے کے پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاکوری شریف میں محفوظ ہے۔

انور سدید نے اس قدیم کتاب ''تاریخ انگلستان'' کو ''سفیر اودھ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب ہندستانیوں کی قسمت پر غلامی کی مہر ثبت ہوگئی۔ سر سید نے محسوس کیا کہ ہندستانیوں بالخصوص ہندستانی مسلمانوں نے نئی تعلیم حاصل نہ کی تو مستقبل میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سائنسی ایجادات کی ضرورت اور مقبولیت روز بروز بڑھ رہی تھی، اس دور میں ہندستانی باشندوں کے لیے انگلستان میں زبردست کشش پیدا ہوئی۔ اردو کے اولین سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش نے سب سے پہلے اس کشش اور جاذبیت کو محسوس کیا اور سفر لندن کے دوران اپنے تجربات و مشاہدات میں براہ راست اضافہ کیا۔ کمبل پوش کے بعد یورپی ممالک کی سیاحت کا رجحان روز بروز ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ سر سید احمد خاں نے بھی رخت سفر باندھ کر لندن کا رخ کیا۔

سرسید کا سفر دوسرے مسافروں سے مختلف تھا، وہ انگلستان کے تعلیمی ماحول کا مطالعہ کرنے اور اس کے بعد ہندستان میں اس کا چلن عام کرنا چاہتے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقائے اردو کے خزانے میں زبردست اضافہ کیا اسی عہد میں چند بیش بہا سفرنامے بھی لکھے گئے۔ سرسید کا سفرنامہ ''مسافرانِ لندن'' انھیں میں سے ایک ہے۔ سرسید احمد خاں کا تعلیمی اور تحقیقی کاوشوں میں ''مسافرانِ لندن'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

''مسیر حامدی'' نواب حامد علی خان کا یہ سفرنامہ انیسویں صدی کے آخری عشرہ کی تصنیف ہے، اس میں واقعات کو صداقت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ سفرنامہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے، پہلی جلد میں ایشیا اور امریکہ کے سفر کا احوال ہے اور دوسری جلد میں یورپ اور مصر کی سیاحت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ 1896ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے نواب حامد علی خاں کے استاد، مولوی فرخی نے باہتمام محمد قادر علی خاں شائع کرایا۔

نواب محمد عمر خاں ریاست محمد گڑھ باسودہ کے رئیس تھے۔ محمد عمر خان کو روداد سفر بیان کرنے کا شوق بھی شوق سفر سے کم نہ تھا، انھوں نے کم و بیش اپنے ہر سفر کے بعد سفرنامہ لکھنے کی کوشش کی اور اس طرح سات سفرنامے یادگار چھوڑے۔ پہلا سفرنامہ ''زادِ سفر'' اندرون ملک کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے، اس سفر میں انھوں نے کلکتہ، لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور کی سیر کی اور ان مقامات کی تفصیلات سے سفرنامے کو گلزار بنایا۔ نواب صاحب نے حجاز مقدس کے تین سفر کیے اور حج بیت اللہ کی سعادت کو ایک سفرنامے کی شکل میں شائقین کے سامنے پیش کیا، ان کا یہ سفرنامہ ''زاد غریب'' کے نام سے مطبع کشور ہند سے 1880ء میں شائع ہوا۔ 1888ء میں محمد عمر خاں نے یورپ کا رخ کیا اور ''آئینۂ فرنگ'' میں لندن، پیرس، اٹلی، سوئزرلینڈ، ترکی وغیرہ کے حالات و کوائف بیان کیے۔ انھوں نے لنکا کا سفر نامہ ''سفرنامہ رئیس'' برما کا سفرنامہ ''نیرنگ رنگون'' اور چین کا سفرنامہ ''نیرنگ چین'' کے نام سے قلم بند کیا۔ ان کے علاوہ اندلس کا سفرنامہ ''قندِ مغربی'' کے نام سے شائع ہوا۔

نواب محمد عمر علی خاں نے ایک عامِ مسافر کی طرح سرسری طور پر سفر نہیں کیا بلکہ جہاں سے گزرے اس کا نقشہ

اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لیا۔ ہر چیز، ہر منظر اور ہر واقعے کو بغور دیکھا اور اپنے قلم کی جنبش سے دوسروں کو بھی دکھایا۔انھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات میں سبھی کو شریک کرنے کی کوشش کی،جس ملک میں پہنچے وہاں کی تہذیب ومعاشرت رسم ورواج، عادات واطوار، تواضع،اخلاق،لہجہ،زبان،تعلیم وتربیت اور سیاسی وسماجی،معاشی اور معاشرتی حالات پر اپنے مخصوص اجمالی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

''سفر نامہ پنجاب'' سر سید کا یہ سفر نامہ 1884ء کے سفر پنجاب کی یادگار ہے،اور مولوی سید اقبال علی نے قلم بند کیا ہے جو اس سفر میں سر سید کے رفیق سفر تھے۔سفر لندن کی طرح سر سید کا یہ سفر بھی مقصد کا دامن تھامے ہوئے تھا، اس کے پیچھے بھی تعلیمی جذبہ کارفرما تھا۔مختلف تعلیمی اور اصلاحی جلسے جلوسوں کا احوال سید اقبال علی نے سادہ اوسلیس انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ سفر نامہ سر سید کی اولوالعزمی، جرأت اور حوصلے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

مرزا نثار علی بیگ کا''سفر نامہ یورپ'' عہد سر سید کا نہایت اہم سفر نامہ ہے۔نثار علی بیگ نے 1885ء میں یورپ کا سفر کیا،، وہ تین مہینے لندن میں مقیم رہے اور ایک دن بھی ضائع کیے بغیر اس شہر بے بدل کی خوب سیر کی۔ سیر وسیاحت کے دوران انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا روز نامچے کی شکل میں تاریخ وار درج کرتے رہے،اس طرح ایک مربوط ومبسوط سفر نامہ تیار ہو گیا۔

''سفر نامۂ روم ومصر وشام'' علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سفر سے واپس آنے کے بعد بزرگون اور دوستوں کے اصرار پر حالات سفر قلم بند کرنے پر مجبور ہوئے۔اس طرح اردو ادب میں ایک وقیع اور پُر از معلومات سفر نامے کا اضافہ ہوا۔ یہ علامہ شبلی نعمانی کی اعلیٰ ظرفی اور عالمانہ وسعت نظر تھی کہ انھوں نے دور دراز ملکوں کے اس سفر کو معمولی اور محض طالب علمانہ کہہ کر اپنے عجز وانکسار کا اظہار کیا، ورنہ یہ سفر اتنے قیمتی تجربات ومشاہدات کا آئینہ دار تھا کہ اگر اس سفر نامے کی صورت میں شائع نہ کیا گیا ہوتا تو اس وقت تک ترکستان اور مصر کے صحیح حالات سے واقفیت کا کوئی اور معتبر ذریعہ اردو زبان کے پاس نہ تھا، دینائے اردو کو شبلی کے ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہونا چاہئے جن کے اصرار پر یہ بیش بہا سرمایہ اردو کے خزانے میں آیا۔

شبلی کے سفر نامے کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اس کو پڑھ کر اگر کوئی شخص اس عہد کے روم ومصر وشام میں قدم رکھتا تو ہر چیز مانوس مانوس سی جانی پہچانی نظر آتی۔معلومات کا ایک ذخیرہ ہے جو نہایت خوبی کے ساتھ قاری کی یادداشت میں منتقل ہو جاتا ہے۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے دو سفرنامے یادگار چھوڑے۔ پہلا سفرنامہ ''وسط ایشیا کی سیر'' اور دوسرا ''سیرِ ایران'' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سفرایران کے واقعات کو آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) نے منتشر یادداشتوں کی مدد سے بہ وقت تمام یکجا کیا اور ''سیرِ ایران'' کے نام سے 192 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے کو مولانا آزاد پریس لاہور سے شائع کیا۔

مولانا آزاد کا دوسرا سفرنامہ وسط ایشیا کی سیاحت کا ثمر ہے جسے آغا محمد اشرف نے مرتب کیا ہے۔ وسط ایشیا کا یہ سفر مولانا آزاد، سفرایران سے بہت پہلے 1865ء میں کر چکے تھے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفرنامہ ''تواریخ عجیب'' موسوم بہ'' کالا پانی'' جو ایک خودنوشت سوانح کے انداز میں لکھا ہوا سفرنامہ ہے انگریزوں کی طویل داستان ظلم وستم کا ایک سیاہ باب ہے۔

مولوی عبدالرحمٰن امرتسری کا سفرنامہ بلاد اسلامیہ، مصر، شام، روم کی سیاحت کا ثمرہ اور حکومت ترکی کی سیاسی بصیرت کا آئینہ خانہ ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن امرتسری نے یہ سفر 1898ء میں اسلامی ممالک کو قریب سے دیکھنے اور مسلمانوں کی بود و باش سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ مولوی عبدالرحمٰن امرتسری کا سفرنامہ ''بلاد اسلامیہ'' مناظر ومظاہر اور واقعات ومقامات کی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کے بیانات کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی ہے اور ایک سچے سیاح اور اچھے سفرنامہ نگار کی طرح اپنے مشاہدات میں قاری کو کچھ اس طرح شریک کرلیا ہے کہ قاری خود کو ان کا شریک سفر محسوس کرنے لگتا ہے۔

سفرنامے کا سفر اگرچہ انیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں شروع ہو چکا تھا لیکن دوسری ادبی اصناف کی طرح سفرنامہ نگاری نے بھی اس صدی کے اختتام تک اپنی حیثیت کو مستحکم کرلیا۔ سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، شبلی

نعمانی اور دوسرے سفر نامہ نگاروں نے اس صنف کو سنوارا اور اس کی ہمیت کو تسلیم کرایا۔ انیسویں صدی میں سفر ناموں کو مواد کے اعتبار سے متنوع اور اسلوب اور زبان و بیان میں پختگی کے لحاظ سے بہتر کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح اس صنف کو دلچسپی اور جاذبیت کی ان صفات سے متصف کیا گیا جن کے بغیر سفر نامے کو قاری کی رفاقت حاصل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے ایسے سفر نامے ہیں جن میں دنیا کے مختلف مما لک کے واقعات موجود ہیں۔ افریقہ، یوپ، چین، ایران، عراق، شام، ترکی، افغانستان، تمام مما لک کی تہذیب وتمدن، طرز معاشرت، رسوم ورواجوں، تعلیم وتربیت اور سیاسی وسماجی اور اقتصادی حالات کا بیان ان سفر ناموں میں بالتفصیل ملتا ہے۔ زبان و بیان، طرز فکر اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے یہ اصلاحی دور تھا۔ اس عہد کی زبان مشکل پسندی کو چھوڑ کر سادگی اور سلاست کی جانب مائل ہو چکی تھی۔ اس دور کے سفر ناموں میں زیادہ تر واقعاتی اور بیانیہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اہم سفر ناموں کا یہ تنقیدی مطالعہ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ اس دور کے سفر نامے علمی مقاصد کی تکمیل کے لیے قلم بند کیے گئے تھے۔ ان سفر ناموں میں حقائق کا بیان غیر مصنوعی انداز میں کیا گیا ہے، یعنی جو چیز جس طرح دیکھی، بیان کر دی، تخلیقی انداز بیان کو بھی اتنا زیادہ دخیل نہیں ہونے دیا کہ حقیقت پر افسانے کا گمان گزرے۔

اس عہد کے سفر نامے صرف شہروں، عمارتوں اور تہذیبوں وتمدن یا کوائف زندگی کی تفسیر وتعبیر یا تاریخ و جغرافیہ کی معلومات کا ذریعہ ہی نہیں، اکتساب مسرت کا وسیلہ بھی ہیں۔ یہ سفر نامے قاری کو ماضی سے متعارف کراتے ہیں اور حال و مستقبل کی تعمیر پر آمادہ کرتے ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے انیسویں صدی میں خاصا تنوع نظر آتا ہے، بعض سفر نامہ نگار جن کو زبان و بیان پر قدرت حاصل نہیں غیر پختہ اسلوب کی گرفت سے اپنے آپ کو باہر نہیں نکال سکے، وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو غرابت کا شکار ہے اور مفہوم کی وضاحت سے قاصر ہے۔ دوسرا طبقہ صداقت کو حقیقت کے انداز میں پیش کرتا ہے یہ لوگ اسلوب کے سائنٹفک استعمال سے واقف ہیں اور حقیقت کو سادہ زبان میں اس خوبی سے قاری کے ذہن میں

اتار دیتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی الجھن یا پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ سرسید کا اسلوب ہے اور سرسید نے اس اسلوب کے ذریعے پیچیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کو بھی پانی کر دیا ہے۔

تیسرا اسلوب سادگی اور تخلیقی پرکاری سے عبارت ہے۔اس اسلوب کی خوبی یہ کہ اس میں حقیقت کو جذبے اور عقل کی آمیزش کے ساتھ کچھ اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کی تاثیر ذہنی مسرت و آسودگی کا وسیلہ بن گئی ہے۔ شبلی نعمانی اور خصوصاً محمد حسین آزاد نے اپنے سفرناموں میں اسی اسلوب کو برتا ہے، وہ سفرنامہ نگار جو رموزفن سے نا واقف تھے ان کی تحریر میں ہمواری نہیں بس ایک واقعاتی صداقت ہے جو ان سفرناموں کو پڑھنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔

بیسویں صدی میں اردو سفر نامے

بیسویں صدی کے نصف اول کے اردو سفر نامے

بیسویں صدی کے نصف اول میں کئی خوبصورت سفر نامے منظر عام پر آئے جن میں ''سیاحت سلطانی'' از نواب سلطان جہاں بیگم والی ریاست بھوپال ''سفرنامہ یورپ وامریکہ'' اور ''سیاحت نامہ'' از نواب لیاقت جنگ بہادر ''مسافر کی ڈائری'' از خواجہ احمد عباس، ''کابل میں سات سال'' از مولانا عبیداللہ سندھی، ''سیر یورپ'' از رفیعہ سلطان، ''سفر یورپ'' از صغریٰ بیگم، نواب محمد عمر علی خاں کے سفرنامے، ''جاپان کا تعلیمی نظم ونسق'' از سرراس مسعود، ''دلی کا پھیرا'' از ملا واحدی، ''سفرنامہ لالہ جنیدرام'' از لالہ جنیدرام، ''روزنامچہ سیاحت کشمیر'' از مہاراجہ جگجیت سنگھ، ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' از مولانا عبدالماجد دریابادی، ''عروس نیل'' از سلطانہ آصف فیضی، ''نظر خوش گزرے'' وغیرہ مختلف النوع خصوصیات کے حامل ہیں، انھیں میں کچھ ایسے سفرنامے بھی ہیں جو اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ کہے جا سکتے ہیں، مثال کے طور پر مہاراجہ کشن پرشاد، شیخ عبدالقادر، خواجہ غلام الثقلین، منشی محبوب عالم، خواجہ حسن نظامی، سید ابوظفر ندوی، قاضی ولی محمد، محمد علی قصوری، سید سلیمان ندوی، نشاط النساء بیگم اور قاضی عبدالغفار کے سفرنامے اپنی اپنی طرز میں منفرد ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد کے وزیراعظم تھےان کا سفرنامہ 1916ء میں منظر عام پرآیا، دکن سے متعلق اس سفرنامے کا عنوان بھی ''سفرنامہ'' ہے۔ایک دوسرا سفرنامہ ''سیر پنجاب'' ہے۔مہاراجہ کشن پرشاد کی شخصیت بڑی پرکشش تھی، ان کا مطالعہ گہرا اور ذہن وسیع تھا۔دکن کے سفرنامے مین ان کے دور کی سیاست اور معاشرت کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔انسانی فطرت کا تجزیہ ان کے سفرنامے کی اضافی خوبی ہے۔حیدرآباد دکن کے تعلق سے ان کا سفرنامہ اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سرشیخ عبدالقادر کے دوسفرنامے ''مقام خلافت'' اور ''سیاحت نامہ یورپ'' ہیں۔مقام خلافت میں ترکستان کی سیاست پر بصیرت افروز خیالات پیش کیے گئے ہیں۔یہ سفرنامہ 1906ء کی سیاحت ترکی سے متعلق ہے اور اس عہد کے مسلم ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔شیخ عبدالقادر اپنے دوسرے سفرنامے ''سیاحت نامہ یورپ'' میں ہندستان کے دیگر سیاحوں کی طرح انگریزوں سے متاثر ہیں مگر مرعوب نہیں، انھوں نے ایک غیر جانب دار سیاح کی طرح یورپ کی تعریف کی ہے، انھیں اچھی چیزوں کے انتخاب کا بڑا سلیقہ ہے۔مناظر فطرت کا بیان خوبی سے کرتے ہیں۔شیخ عبدالقادر کے سفرناموں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی پس منظر کا حسین امتزاج ہے۔ان کا قلم مناظرہ واقعات کو زندہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

خواجہ غلام الثقلین مناظر اور اس کے گردوپیش سے بہت جلد بے تکلف اور مانوس ہوجاتے ہیں، ان کے سفرناموں میں تاریخ اور جغرافیہ کو پس منظر کے طور پر ابھارنے کا انداز نمایاں ہے، وہ تاریخ کو معاشرتی پس منظر اور جغرافیہ کو موجودہ تناظر میں دیکھتے ہیں۔ان کی نگاہیں ایسے حالات و واقعات میں بھی دلچسپی لیتی ہیں جنھیں دوسرے سیاح لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ان کا سفرنامہ بعنوان ''سیاحت نامہ'' روس، قسطنطنیہ، ایران عراق، عرب (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) کی سیاحت و زیارت کا حاصل ہے، اسلوب سادہ و پرکار ہے، بے تکلفی، برجستگی اور حقیقت نگاری ان کے اسلوب کے عناصر ثلاثہ ہیں۔

منشی محبوب عالم صحافی ہیں، اردو کے مشہور ومعروف ''پیسہ اخبار'' (لاہور) کی ادارت نے انھیں باریک بینی اور جزئیات نگاری کا ماہر بنا دیا ہے، انھوں نے اپنے سفرنامے ''عجائبات یورپ'' اور ''سفرنامہ بغداد'' میں نت نئی

خبروں اور معلومات کا ایسا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو کسی اور سفر نامے میں مشکل سے ملے گا۔ تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی ان کے سفر ناموں کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے منشی محبوب عالم ملکی اور عالمی سیاست سے دلچسپی اور واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں ہندستان کی علمی کم مائیگی کا اندازہ تھا، وہ ایک وطن پرست اور قوم پرور انسان کی طرح ملک کو ترقی کی راہ پر دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ چناں چہ اپنے سفر ناموں کے ذریعے بھی انھوں نے معلومات فراہم کرنے کے علاوہ قوم کی غیرت وحمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

سید ابوظفر ندوی کا ''سفر نامہ برہما'' برما کے تعلق سے اردو کا اولین سفر نامہ ہے۔ برما کی مانند، برما کے سفر نامے میں بھی سیاحوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی وہ چکا چوند نہیں جو یورپ کا حصہ ہے اور ایشیائی سیاحوں کی اکثریت جہاں پہنچ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ برما کا راستہ اور منزل یورپ کی ترقی یافتہ مسافتوں کی طرح سہل الحصول بھی نہیں۔ سیاح کی راہ میں دیو پیکر پہاڑ اور متعدد وسیع وعریض خلیجیں حائل ہیں سید ابوظفر ندوی کا سفر نامہ برما کی سیاسی، سماجی، تجارتی اور معاشرتی زندگی کا عکاس ہے۔

قاضی ولی محمد اندلس کے مسافر ہیں۔ ولی محمد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے آثار دیکھنے کے آرزومند تھے انھوں نے 1924ء میں اندلس کا سفر کیا تھا۔ قاضی ولی محمد نے اندلس کی تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا اور ماضی کو حال میں تلاش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ ''سفر نامہ اندلس'' کے علاوہ قاضی ولی محمد کے دو اور سفر نامے ''مغرب اقصیٰ'' اور ''سفر نامہ مصر'' بھی ہیں۔ ان سفر ناموں میں تخلیقی انداز اختیار کیا گیا ہے اور تاریخی حقائق کی بازیافت بھی کی ہے۔ قاضی ولی محمد ماضی کو حال میں لانے کے لیے خود ماضی میں سانس لیتے ہیں۔

محمد علی قصوری کا سفر نامہ ''مشاہدات کابل ویاغستان'' دوران سفر لکھی ہوئی آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں سفر نامہ اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔ یہ سفر نامہ سیاسی اغراض کا پابند ہے اور ہندستان کی جنگ آزادی کے پس منظر میں اس کے واقعات مد وجزر کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ محمد علی قصوری نے افغانستان کا سفر مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے اور ہدایت کے

مطابق اختیار کیا تھا۔ اس سفر کا خاص مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب کابل پہنچ کر وہاں کی حکومت کو ہندستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تا کہ انگریز حکومت کا زور کم ہو اور ہندستانی غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو کر خود اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوسکیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز روس کی مدد سے افغانستان پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ یہ مشن ناکام رہا اور محمد علی قصوری اپنا مقصد پورا نہ کر سکے لیکن افغانستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالت سے مکمل طور پر واقف ہونے کی وجہ سے اپنی داستان سفر کو بامعنی معلومات افزا اور حقیقت آشنا بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ''مشاہدات کابل و یاغستان'' امیر حبیب اللہ کے افغانستان کی سیاسی دستاویز ہے۔

سید سلیمان ندوی، نادر خان کے عہد حکومت میں افغانستان گئے تھے۔ یہ عالموں کی ایک جماعت تھی جس میں اسلام کے تین عظیم مفکر، ڈاکٹر محمد اقبال، سر راس مسعود اور اور خود سید سلیمان ندوی شامل تھے۔ کابل کے بادشاہ نادر خاں نے 1933ء میں اپنے ملک کی تعلیمی اصلاحات کے سلسے میں صلاح ومشورے کی غرض سے ان دانشوروں کو مدعو کیا تھا۔ ل ''سیر افغانستان'' اسی تعلیمی اور اصلاحی سفر کی یادگار ہے۔ سید سلیمان ندوی ایک تبحر عالم، تاریخ داں اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ سیر افغانستان میں مولانا کی ان تینوں خصوصیات کی جھلکیاں موجود ہیں۔

مولانا کا تبحر علمی اور تاریخی شعور سفر نامے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ مولانا نئے اپنے وسیع مطالعے کی مدد سے تاریخ آثار کو بڑی خوبی سے یک جا کیا ہے۔ افغانستان کے جغرافیائی نقوش اور تاریخی آثار ''سیر افغانستان'' میں غیر جامد اور متحرک نظر آتے ہیں۔

نشاط النساء بیگم نے ''سفر نامہ عراق'' اور ''سفر نامہ حجاز'' دو سفر نامے یادگار چھوڑے۔ نشاط النساء بیگم کوئی معمولی خاتون نہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی بیگم تھیں۔ مولانا حسرت موہانی جیسے بے باک مجاہد آزادی اور عظیم المرتبت شاعر کی بیگم ہونا بھی اگرچہ ایک اعزاز ہے۔ مگر نشاط النساء بیگم خود بھی ایک عظیم خاتون تھیں۔ مولانا حسرت موہانی کی عظمت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نشاط النساء بیگم حسرت موہانی کی بیگم ہونے کے علاوہ ان کی دوست، صلاح کار، سیاسی اور صحافتی مشیر اور رفیق سفر بھی تھیں۔ بیگم حسرت موہانی نے 1936ء میں مولانا حسرت موہانی کے

ہمراہ عراق کا سفر کیا اور ''سفر نامہ عراق'' مرتب کیا۔ یہ سفر نامہ 1937ء میں مولانا حسرت موہانی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ نشاط النساء بیگم نے عراق کو ایک مشرقی خاتون کی نظر سے دیکھا اور سفر کی تمام جزئیات کو ''سفر نامہ عراق'' میں سمیٹ لیا۔ عراق کی نسوانی دنیا اندرون خانہ زندگی کے پہلو اور گھر سے باہر کی روش ''سفر نامہ عراق'' میں تفصیل اور فراوانی سے پیش کی گئی ہے۔ بیگم حسرت موہانی کے اس سفر نامے سے مرد سیاحوں کے لکھے ہوئے ان سفر ناموں کی خامیوں، کوتاہیوں اور لاعلمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے جن میں خواتین سے متعلق یا تو ناقص سطحی اور سرسری معلومات ہوتی ہیں یا سرے سے ان کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

''لیلیٰ کے خطوط'' کے مصنف قاضی عبدالغفار نے اپنے طرز تحریر کی بدولت دنیائے ادب کی جانی مانی شخصیت ہیں۔ ''نقش فرنگ'' ان کے سفر انگلستان کی روداد ہے۔ یہ سفر اس دور میں کیا گیا تھا جب ہندستانی سیاست دانوں اور دانشوروں کا ایک وفد احیائے خلافت کے مسئلے پر برطانوی وزیر اعظم لارڈ جارج سے گفتگو کرنے لندن گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار ایک معزز رکن کی حیثیت سے اس وفد میں شامل تھے۔ ملاقات کا نتیجہ حوصلہ افزا نہیں تھا، مگر قاضی عبدالغفار کے قلم نے سیاسی وقائع نگار کی حیثیت سے انگریز سیاست اور اس قوم کی نفسیات پر بصیرت افروز تبصرے کیے ہیں۔ قاضی صاحب اپنی مرصع زبان میں مغربی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔

سر رضا علی کا ''اعمال نامہ'' فنی اعتبار سے سفر نامہ کم اور آپ بیتی زیادہ ہے لیکن یہ آپ بیتی ایک روداد سفر بھی ہے۔ اس لیے سفر ناموں کی فہرست میں شامل ہے۔ سر رضا علی ایک ماہر قانون داں تھے۔ انھوں نے روس اور یورپ کے کئی سفر کیے 1925ء میں پہلی بار ایک ڈیپوٹیشن کے ممبر کی حیثیت سے جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندستانیوں کے حالات سے باخبر ہونے کی خاطر جنوبی افریقہ گئے۔ دوسری مرتبہ انھیں جنوبی افریقہ میں ہندستان کی انگریز حکومت کا ایجنٹ جنرل (ہائی کمشنر) مقرر کیا گیا اور انھوں نے وہاں 1935ء سے 1938ء تک قیام کیا۔ ''اعمال نامہ'' انھی اسفار کی روداد ہے۔ یہ سفر نامہ مصنف کی آپ بیتی کا حصہ ہے اس لیے قدرتی طور پر ان کی ذات کے گرد سفر کرتا ہے اور مجموعی طور پر سر رضا علی کی ذاتی اور نجی فتوحات کا اظہار ہے۔ لیکن افریقہ کے سیاسی حالات اور ان میں

ہندستانیوں کی حیثیت، وہاں کی تہذیب ومعاشرت اوراسی کے ساتھ سر رضا علی کا ذوق سلیم، اسلوب کی شائستگی، بر جستگی اور حس مزاح نے اس سفر نامے کو وہ آتشہ بنا دیا ہے۔''اعمال نامہ'' کے مطالعہ سے افریقہ کے حالات اظہر من الشّمس ہوجاتے ہیں اور سر رضا علی کے انداز تحریر سے دلچسپی قائم رہتی ہے، یہ سفرنامہ زبان و بیان کے تخلیقی استعمال کی وجہ سے فکشن کے دائرۂ اثر میں آتا ہے۔

مندرجہ بالا سفر ناموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر قدیم سفر نامہ نگاروں کا مقصد اپنے بعد آنے والے مسافروں اور سیاحوں کے لیے معلومات فراہم کرنا اور سفر کی ان دشواریوں کو آسان بنانا تھا۔ جن سے وہ خود گزر کر آئے تھے، اس طرح سفر نامہ نگاری خدمت خلق کا ایک ذریعہ بھی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سفر سے واپس لوٹ کر آنے والے سیاحوں سے سفر کا احوال سننے کے لیے لوگ بے چین رہا کرتے تھے۔ سیاحوں کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ سفر نامہ نگار بھی اپنی قسمت پر رشک کرتا اور سفر سے متعلق تمام مشاہدات بالتفصیل بیان کرتا۔ وہ اپنے قاری کو راستوں کے مسائل اور منزلوں کے، معاملات سے روشناس کراتا، وہ جہاں بھی جاتا وہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی حالات کی تفصیلات قلمبند کرتا۔ ہر ملک کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج، زبان، عقائد اور مذہبی جزبات و احساسات کی وضاحت کرتا۔ قدیم سفر نامہ نگار جو کچھ بھی کہتا تاریخ اور جغرافیہ کا دامن تھام کر کہتا، اس کی روداد سفر کا انحصار تاریخ کے پس منظر اور جغرافیہ کے تناظر میں ہوتا تھا، روایتی انداز کا سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے کی اہمیت، افادیت اور مقاصد سے واقف ہوتا، وہ اپنے مقصد کو کبھی پس پشت نہیں ڈالتا، اسے بہ خوبی معلوم تھا کہ اس کے سفر نامے کو رہبری کے فرائض کے ساتھ قاری کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرنا ہے، اس لیے اچھا سفر نامہ نگار ادبی چاشنی کا بھی پاس ولحاظ کرتا تھا۔

قدیم سفر ناموں میں سیاح غیر جانبدار رہتا تھا اسے اگر کوئی منظر دکھانا مقصود ہوتا تو منظر کو قاری کے سامنے لاکر خاموشی سے الگ ہوجاتا تھا۔ اس کے برخلاف آج کا سفر نامہ نگار اپنے وجود پر زیادہ اصرار کرتا ہے۔ وہ مناظر کو صرف آنکھ سے دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مشاہدے میں آنے والی ہر شئے کا حصہ بن جانے اور اس پر اپنا ردعمل ظاہر

کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا سفر صرف بصری یا نظری نہیں، جذباتی اور احساساتی بھی ہوتا ہے، وہ ماضی کو صرف ماضی کی طرح نہیں دیکھتا بلکہ اپنے آپ کو ماضی میں محسوس کرتے ہوئے ماضی کو حال میں لانے کی کوشش کرتا ہے، تاریخ اس کے لیے صرف تاریخ نہیں، حصولِ عبرت اور احساسِ فخر و مسرت کا ذریعہ بھی ہے۔ جدید سفر نامہ نگار اپنی ذات کو سفر نامے سے خارج نہیں ہونے دیتا بلکہ خود مرکز و محور بن کر ہر شئے کو اپنے گرد و پیش میں محسوس کرتا ہے اور گرد و پیش کے ہر واقعے، ہر منظر پر تبصرہ کرتا ہے اور وہ واقعاتِ سفر سے زیادہ کیفیاتِ سفر کو اہمیت دیتا ہے۔ جدید سفر نامہ نگار اپنے جذبات و احساسات میں مدجزر محسوس کرتا ہے اور احساس کی ہر لہر کو تخلیقی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جدید سفر نامہ نگار کسی مقصد پر نظر رکھنے کی جگہ سفر ہی کو مقصودِ سفر بناتا ہے۔ جدید سفر ناموں کا اسلوب عام طور پر تخلیقی ہے اور تخلیقی بھی ایسا کہ بعض اوقات ناول، داستان یا طویل افسانے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

آزادی کے بعد سے عصر حاضر تک اردو سفر نامہ

تقسیم ہند کے بعد اردو سفر نامہ نگاری میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ تقسیم کے اثر نے دوسری نثری اصناف کی طرح سفر نامے کو بھی متاثر کیا، خاص کر وہ سفر نامہ نگار جو تقسیم ہند کے زیر اثر منقسم ہونے کے بعد جب اپنے وطن میں مسافر بن کر آتے ہیں تو حال سے زیادہ ماضی میں سفر کرتے ہیں۔ اور یادوں کے وسیلے سے بچپن کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے سفر نامہ نگاروں نے بھی تاریخ و جغرافیہ کے غلبے اور معلومات فراہم کرنے کے طریقۂ کار اور دائرۂ اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور سفر نامے کو اپنے ذاتی احساسات، تاثرات اور نظریات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

ہندو پاک کے سفر ناموں سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دو جانب کے سفر نامہ نگاروں کو اپنے آبائی وطن میں بڑی محبتیں ملیں ہیں۔ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے باوجود اہل وطن نے انھیں آنکھوں میں جگہ دی ہے۔

ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سیاست کا کھیل خواہ

کچھ بھی ہو عوام ایک دوسرے سے قریب آنا چاہتے ہیں، سیاسی طور پر اغیار بن جانے والے ان پڑوسیوں کی ملاقاتوں کے جذبات انگیز مناظر دیکھنا ہوں تو ان کے سفر ناموں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے جو ہند و پاک کا سفر کرنے والے سیاحوں کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔

پاکستان سے متعلق سفر نامے، ان سفر ناموں میں ''سفر پاکستان'' خواجہ حسن نظامی، ''پاکستان میں ڈھائی ہفتے'' مولانا عبدالماجد دریابادی، ''جزیروں کی سرگوشیاں'' بلراج کومل، ''تم کو کہیں۔۔۔۔۔'' ہرچرن چاولہ ''خوشبو کا سفر'' ڈاکٹر کیول دھیر ''زرد پتوں کی بہار'' رام لعل اور ''پاکستان کی یاترا'' جوگندر پال، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندستان سے متعلق سفر نامے، ہندستان سے پاکستان جانے والوں کی طرح پاکستان سے ہندستان آنے والے مسافروں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ رشتے داروں سے ملاقات کرنے والے عام مسافروں کے علاوہ سیاست داں، ادیب، شاعر، محقق، نقاد، ناول نویس، افسانہ نگار فلم کار، مگو کار، صحافی اور مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ان مسافروں میں کچھ ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے سفر ہندستان کی یادگار بنانے کے لیے سفر نامے قلمبند کیے ہیں۔ ان سفر نامہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا ''ایک طویل ملاقات''، انتظار حسین ''زمین اور فلک''، حسن رضوی ''دیکھا ہندستان''، شیخ منظور الٰہی ''دردِ دل کوشاں''، رفیق ڈاگر ''اے آب رود گنگا''، ممتاز مفتی ''ہند یاترا''، ڈاکٹر فتح پوری ''دید و باز دید'' وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔

تقسیم کے بعد جن سفر نامہ نگاروں نے قاری کو اپنی طرف متوجہ کیا ان میں ڈاکٹر عابد حسین ''رہ نوردشوق''، صالحہ عابد حسین ''سفر زندگی کے نئے سوز و ساز''، سید احتشام حسین ''ساحل اور سمندر''، عبادت بریلوی ''ترکی میں دو سال''، سید ابوالحسن ندوی ''ترکی میں دو ہفتے، شرق اوسط میں کیا دیکھا''، پروفیسر گوپی چند نارنگ ''سفر آشنا''، خواجہ غلام السیدین ''دنیا میرا گاؤں''، وزیر آغا ''بیس دن انگلستان میں'' وغیرہ نمائندہ نام ہیں۔ انھوں نے سفر نامے کے فن کو مجروح کیے بغیر اس میں ادبی چاشنی، لطافت، جاذبیت اور شگفتگی پیدا کی ہے۔ آزادی کے بعد لکھنے والوں میں یہ سفر نامہ نگار نئے بھی ہیں اور پرانے بھی، اپنی عمروں کے لحاظ سے ان میں سے بیشتر حضرات کا قلم آزادی سے قبل

جوان تھا۔آزادی کے بعدان کی نگارشات میں پختگی آ گئی اور بہ استثنائے چندا کثر کا قلمی سفر آج بھی جاری ہے۔مگر انھوں نے سفر نامے کوسفر نامے کی حدود میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔

قدیم روایت سے انحراف کرنے والے سفر نامہ نگاروں میں جنھوں نے اپنی شناخت بنائی ان میں جمیل الدین عالی۔مستنصر حسین تارڈ،قرۃ العین حیدر،قدرت اللہ شہاب،رام لال،عطاالحق قاسمی،عبداللہ ملک اور صغریٰ مہدی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان ادیبوں نے اردو سفر نامے کو نئے اسالیب سے روشناس کرایا۔اس طرح انھوں نے اردو سفر نامے کونئی سمتوں میں آگے بڑھنے کی راہ ہموار کی۔

عصر حاضر میں سفر نامے کی سمت ورفتار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو سفر نامے نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں، جہاں تک اسلوب اور ٹیکنک کا سوال ہے یہ صنف بڑی حد تک قدیم روش پر گامزن رہی،لیکن فنی صلاحیت،علمی استعداد اور تخلیقی شعور رکھنے والوں کے لیے تمام راہیں کبھی مسدود نہیں ہوتیں،وہ ہر جگہ ارتقا کی گنجائش نکال لیتے ہیں،چناں چہ عصر رواں کا سفر نامہ تجربات ومشاہدات کی رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ سفر نامہ نگار کے جذبات واحساسات اور ردعمل کی زبان بن گیا ہے،آج کا سفر نامہ نگار صرف تاریخی اور جغرافیائی سطح پر معلومات جمع کرنے کا قائل نہیں بلکہ تخلیق کی فنی چابک دستی کے ساتھ اپنی بات کو اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ قاری بھی سفر نامہ نگار کے تجربات ومشاہدات میں شریک ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس جو سفر نامے روکھے، پھیکے اور غیر ادبی انداز میں صرف معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں ان کی حیثیت گائڈ بکوں سے زیادہ نہیں۔اس قبیل کے سفر نامے قبول عام کی سند حاصل نہیں کرتے۔

فنی اعتبار سے سفر نامہ لکھنے کے لیے روز نا مچون، یادداشتوں اور خطوط کی قدیم تیکنک آج بھی اسی طرح رائج ہے،البتہ تخلیقی انداز بیان کو فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔قدیم سفر نامہ نگار نئی سرزمین کی تلاش کا احوال اجنبی دیس کے بازاروں کی رونق،تہذیب ومعاشرت،رسم ورواج،عجائب وغرائب،تاریخ وجغرافیہ اور تمدن کی تفصیل رقم کرتا تھا۔ پڑھنے والے اس تفصیل کے ذریعے گھر میں بیٹھے بیٹھے سفر نامے کے معلوماتی ذخیرے سے فیض یاب ہو جاتے تھے،

مگر آج صورت حال مختلف ہے، آج معلومات حاصل کرنے کے بے شمار ذرائع ہیں اور ان ذرائع نے دنیا کے کم و بیش تمام ممالک کی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور سماجی تفصیلات عام کردی ہیں، یہی وجہ ہے کہ نئے سفرنامے کا اندازہ بھی بدل گیا ہے، آج کا سیاح اشیاء کا شمار اور افراد کا تعارف کرانے کے بجائے ذاتی تاثرات، جذبات و احساسات اور نجی ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ قدیم سفرناموں کی بہ نسبت تخلیقی انداز پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، قدیم سفرنامے کسی نہ کسی مقصد کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور ان میں سے بیشتر سفرناموں کا مقصد معلومات بہم پہنچانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قدیم سفرناموں میں انسانی مفادات سے تعلق رکھنے والے تمام پہلوؤں پر ہمہ وقت نظر رکھی جاتی تھی۔ نیا سفرنامہ دوسروں سے زیادہ اپنے لیے لکھا جارہا ہے۔ جدید سفرنامہ نگار کو پردیس کے مظاہر و مناظر میں اپنی ہی ذات ڈوبتی اُبھرتی نظر آتی ہے۔ سفرنامہ اس کے نزدیک جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی ہے۔ نیا سفرنامہ اظہار بیان کے وسیلے فکشن کے حدود میں داخل ہوگیا ہے، حالاں کہ فکشن ایک خاص طرز بیان کا فن ہے۔ ناول اور افسانے کا ماحول، فضا، کردار و واقعات سبھی کچھ تصوراتی اور تخیلاتی ہوتا ہے، فکشن کے تخلیقی آداب اور مطالبات فن بھی سفرنامے سے مختلف ہوتے ہیں۔ سفرنامہ نگار ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتا ہے، آنکھوں دیکھی حقیقتوں اور سچائیوں کو ادبی انداز میں بیان کرتا ہے۔ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات میں بذات خود شریک ہوتا ہے اور چشم دید گواہ کی حیثیت سے ان کو بیان کرتا ہے۔ بیشتر سفرناموں میں سفرنامہ نگار کی ذات مناظر و واقعات سے الگ نظر آتی ہے، جیسے ان تمام چیزوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو، یہ بھی ایک قسم کی انتہائی غیر جانبداری اور احتیاط کی دوسری انتہا ہے جس کے زیر اثر قدیم سفرنامہ نگار اپنی ذات کو سفرنامے سے بالکل جدا رکھتا تھا، دوسری سمت عصر حاضر کا سفرنامہ نگار اپنے آپ میں سفر کرتا ہے اور سفرنامے کو اپنی شخصیت اور ذات وصفات کے اظہار کا وسیلہ خیال کرتا ہے، حالاں کہ عصر حاضر کے سفرنامہ نگار کا یہ احساس حقیقت سے قریب تر ہے کہ سفرنامے کو صرف معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا نہ ادب کی خدمت ہے نہ خود سفرنامے کی، لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سفرنامہ نہ تو ناول ہے نہ افسانہ ہے اور نہ صرف سفرنامہ نگار کی ذات وصفات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔

نئے سفر نامے میں سفر اور سفر نامہ نگار ایک دوسرے میں اس درجہ پیوست ہیں کہ انھیں الگ کر کے دیکھنا محال ہے، ان سفر ناموں میں بے جان اشیاء بھی تخلیق کے سحر سے جاندار معلوم ہوتی ہیں، پہاڑ، ندیاں، سناٹے، تنہائی، میدان، ریگ زار، چمن زار، فلک، ستارے، چاند، پھول، کانٹے، سڑکیں، گلیاں، آبادیاں، ویرانے، دورودیوار غرض ہر شئے میں قوت گویائی پیدا ہو جاتی ہے اور سفر نامہ نگار ان سے گفتگو کرتا ہے۔ اب سفر نامہ محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک سیاح کی فکری اور روحانی واردات بن گیا ہے۔

حواشی

(1)اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ،مرزا حامد بیگ،ص38

(2)اردو ادب میں سفر نامہ،ڈاکٹر انور سدید کے صفحہ 107

تیسرا باب

اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ

(2000ء کے بعد)

اردو میں خواتین کی سفر نامہ نگاری کا جائزہ لیں تو اولیت کا سہرا نازلی رفعیہ سلطان کے سر ہے۔ نازلی رفعیہ سلطان کا سفر نامہ ''سیر یورپ'' 1908ء میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ سفر یورپ کے دوران ہندستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے جب کہ اس سفر نامے کی دوسری نمایاں پہچان نسوانی انداز تحریر ہے۔ ''سیر یورپ'' میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب کا مشاہدہ جداگانہ لطف کا حامل ہے۔ دوسری سفر نامہ نگار خاتون بیگم سربلند جنگ بہادر کا سفر نامہ ''دنیا عورت کی نظر میں'' 1910ء میں شائع ہوا۔ اس سفر نامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مشرقی عورت یورپ کے تہذیبی مطالعے کو کس قدر اہمیت دے رہی تھی۔

یوں بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی ابتدا خواتین کے سفر ناموں میں یورپ کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے سے ہوئی اور اسے بھی ایک اتفاق کہہ لیں کہ اردو کی تیسری سفر نامہ نگار خاتون نے ''سفر نامہ مجاز'' قلم بند کیا اور یوں دنیا تک رسائی کے جتن میں ہماری خواتین مرد حضرات سے پیچھے دکھائی نہیں دیتیں۔ تیسری سفر نامہ نگار خاتون نواب سلطان جہاں بیگم (شاہ بانو) والیہ ریاست بھوپال تھیں۔ ان کا سفر نامہ ''سیاست سلطانی''، ''سفر نامہ حجاز'' 1911ء میں اشاعت پذیر ہوا یہاں اس حقیقت کی وضاحت از حد ضروری ہے کہ وسط ہند کی مشہور اسلامی ریاست بھوپال کی مسند حکومت پر یکے بعد دیگرے چار خواتین بیٹھ چکی ہیں۔ جن میں نواب سلطان جہاں (ارشاد بانو) اپنی انتظامی قابلیت، تعلیم نسواں کی حمایت، تعلیم کے فروغ اور داد دہش کی وجہ سے از حد مقبول اور مشہور رہی ہیں۔ ان کی دیگر کتب میں گوہر اقبال اور کتاب معیشت قابل ذکر ہیں۔ بیگم ہمایوں مرزا کا سفر نامہ ''بھوپال و آگرہ و دہلی'' 1918ء میں سامنے آیا۔ ان کا اصل نام صغریٰ تھا۔ یاد رہے کہ انھیں صغریٰ ہمایوں مرزا کی سرپرستی میں لاہور سے مجلّہ ''تہذیب نسواں'' کا اجرا 1898ء میں ہوا تھا۔ آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھیں اور ان کا حلقۂ اثر سارے ہندستان کے متوسط اور اردو دان مسلم گھرانوں تک تھا۔ ان کا یہ سفر بھوپال آگرہ اور دہلی کی تہذیبی بہنوں

سے رابطے کی ایک صورت تھی۔ 1924ء میں صغریٰ بیگم حیا کا ''سفرنامہ یورپ'' سامنے آیا اور لگ بھگ اسی زمانے میں فاطمہ بیگم ''سفرنامہ مجاز'' شائع ہوا۔لیکن خواتین کی سفرنامہ نگاری کے اولین دور میں سب سے زیادہ شہرت نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) کے حصے میں آئی۔نشاط النساء بیگم کے دو سفرنامے ''سفرنامہ عراق'' 1937ء اور سفرنامہ ''مجاز''، ''حج نامہ'' ازحد مقبول ہوئے۔نشاط النساء نے اپنے خاوند مولانا حسرت موہانی کے ہمراہ 1936ء میں عراق تک کا سفر کیا تھا۔انھوں نے ''سفرنامہ عراق'' قلم بند کرتے ہوئے عراق کے طرز تمدن کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔اور شگفتہ طرز بیان اپنایا۔

اردو میں سفرنامے کافی تعداد میں لکھے گئے ہیں اور اس دور میں بھی لکھے جا رہے ہیں اس لیے سب کا الگ الگ جائزہ لینا مشکل تھا چناں چہ کچھ اہم سفرناموں کو ہی راقم الحروف نے اپنے مقالے کا حصہ بنایا ہے۔

جہاں طرز زندگی اور خیالات کے اظہار میں اور فکشن نگاری کو پروان چڑھانے میں خواتین کا اہم رول ہے وہیں اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ بھی بہت اہم ہے۔

2000ء کے بعد خواتین سفرنامہ نگاروں میں لالی چودھری، اے۔امیر النساء، نیلوفر ناز نحوی قادری وغیرہ کے نام اس ضمن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ذیل میں یکے بعد دیگرے 2000ء کی تین متذکرہ خواتین کے چھ سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

لالی چودھری اور ان کے سفرنامے

لالی چودھری بطور فکشن نگار اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔لالی چودھری کے پہلے افسانوی مجموعے ''حد چاہیے سزا میں۔۔۔'' کو ادبی حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ قابل رشک ہے۔لالی چودھری نے جتنے اچھے افسانے لکھے اتنے ہی اچھے سفرنامے بھی لکھے انھیں سیر وسیاحت کا بے حد شوق ہے۔وہ چار بَرِّ اعظموں کے کئی ممالک کا سفر کر چکی ہیں۔اب تک ان کے چار سفرنامے شائع ہو چکے ہیں ''دلی''، ''پیرس''، ''جنیوا'' اور ''اسپین''۔

لالی چودھری 14اگست 1950 کولائل پور(موجودہ فیصل آباد) پاکستان میں پیدا ہوئیں لالی چودھری کا نام نعیم اصغر رکھا گیا۔لیکن مشہور اپنے قلمی نام لالی چودھری سے ہوئی۔قدامت پسند زمین دار گھرانے کے فرد ہونے کے باوجود ان کے والد چودھری علی اصغر بڑے روشن خیال اور لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔والد کی خواہش تھی کہ لالی چودھری ڈاکٹر بنیں،لیکن مزاج کی نفاست کی وجہ سے ایف ایس سی، کے بعد کمسٹری میں ایم۔ ایس سی کرنے کا ارداہ پورا نہ کرسکیں بلکہ انھیں ایم اے پولیٹکل سائنس پر اکتفا کرنا پڑا۔انھیں سیر و سیاحت اور غیر مما لک کی تاریخ جاننے کا بہت اشتیاق ہے۔ان کی دوست کے مطابق وہ تاریخ کا مذہب کی طرح مطالعہ کرتی ہیں۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق رکھتی ہیں۔

ایم اے کے دوران ان کی شادی ہوگئی شوہر برطانیہ کے تھےلیکن لالی چودھری کو برطانیہ میں رہنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ اپنے شوہر کے ساتھ یو،ایس،اے لاس اینجلس میں 1972ء میں آگئے اور تینتالیس سال وہ وہیں مقیم ہیں۔

لالی چودھری کو سیاحت کا بے حد شوق ہے۔اب تک چار براعظموں کے ستائیس مما لک اور یو،ایس،اے کی پندرہ ریاستوں کی وہ سیر کر چکی ہیں۔وہ ہر ملک کی سیاحت سے قبل وہاں کی تاریخ وجغرافیہ کا ضرور مطالعہ کرتی ہیں تا کہ وہ جس ملک میں سفیر بننے جارہی ہیں اس کے نشیب وفراز اور تہذیب وثقافت سے پوری طرح آ گہی کے ساتھ وہاں کی تواریخ کے مدنظر سیاحت کرسکیں۔

لالی چودھری نے اپنا پہلا سفرنامہ 2002ء میں ’’دلی ایک شہر آرزو‘‘ لکھا، جسے عبدالرحمان صدیقی مدیر ’’اردو لنک‘‘ نے قسط وار شائع کیا۔2002ء میں ہی پیرس کا سفرنامہ لکھا،اس وقت ’’اردو لنک‘‘ سے عبدالرحمان صدیقی علیٰحدہ ہو گئے تھے۔اور اسے فروخت کردیا تھا۔مجتبیٰ حسین صاحب کے اصرار پر انھوں نے یہ سفرنامہ ’’خیاباں خیاباں ارم‘‘ کے عنوان سے لکھا۔سورن صاحب کے اصرار پر جنیوا کا سفرنامہ لکھا۔پھر ’’سفرنامہ اندلس‘‘ خود اپنے ارادے سے 2010ء میں تحریر کیا۔جو ماہنامہ ’’سب رس‘‘ میں سلسلہ وار شائع ہوا۔موجودہ وقت میں ان چاروں

سفرناموں کو ترتیب دے کر ایک ہی جلد میں بنام ''لالی چودھری کے سفرنامے'' ڈاکٹر رفیعہ سلیم صاحبہ نے 2016ء میں جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی سے شائع کیا ہے۔ ذیل میں ہر ایک سفرنامے کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

سفرنامہ ''دلی ایک شہر آرزو''

لالی چودھری اس سفرنامے کی ابتدائی سطروں میں دلی کی سیاحت کے وفورِ اشتیاق میں مستغرق ہو کر کہتی ہیں کہ، طیارہ دو دن سے شناسا اور اجنبی ملکوں، سمندروں اور صحراؤں کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا صبح کے وقت ہزاروں سال کی راجدھانی دلی میں لینڈ ہوا تھا۔ اور اس ایک صبح میں میری زندگی کی ان گنت صبحیں مدغم تھیں۔ میں جو بڑے ارمانوں سے ؎

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

کے مصرعے سے اپنے جذبات قلب اور مشتاق دید کو سمیٹ دیا۔

لالی چودھری کے تعلق سے متذکرہ چند سطور میں کہا گیا تھا کہ وہ تاریخ و جغرافیہ کے مطالعہ میں منہمک رہتی ہیں خاص کر جس شہر کی سیاحت کریں ذیل میں شہر دلی کا تاریخی اعتبار سے نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اچھا تو یہ پانڈوؤں کا وہ عظیم شہر اندر پرستھ جس کے بارے میں مہابھارت کے اشلوک یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان شہر تھا جس کی خوب صورتی کی مثال اس خاک دنیا تو کیا دیوتاؤں کی آسمانی دنیا میں بھی نہیں ملتی''۔(1)

دو دن کی طویل مسافت کے بعد لالی چودھری ہندستان کی راجدھانی دلی میں پہنچی اپنے طیارے سے اتر کر دلی کے سیاحت کی تفصیل کے ساتھ ساتھ انھوں نے آگرہ، فتح پور کا سفر بھی ایر پورٹ پر درج کرایا۔

اب لالی چودھری دلی یعنی اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر میں قدم رکھ چکی تھیں، وہ خود کہتی ہیں! کہ

''کالج کے زمانے میں لڑکیاں لندن اور پیرس کے لیے ہوکے بھرتی تھیں اور میں دلی اور لکھنؤ جانے کے خواب دیکھا کرتی تھی''(2)

دلی سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا اور وہ اس دلی میں پہنچ چکی تھی جس کی تاریخ مہابھارت سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ وہ دلی جہاں عالموں، قطبوں اور قلندروں کے ملجا و ماویٰ کی زیارت گاہیں ہر سیاح کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور تاریخی اعتبار سے سارے شہر میں بنیں قدیم عمارتیں ہزار سالہ تاریخ بیان کرتی ہیں کہ ہم عزت وعفت کے راج دلارے اور اس مٹی کو جگ میں سونا بنانے کے لیے آئے تھے۔ گرچہ یہاں کی عمارتیں بوسیدہ ہوگئی ہیں مگر نقوش رفتگاں آج تک اسی آب وتاب کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔

لالی چادھری کے ہندستان سے گہرے مراسم ہیں اپنے احباب، دوستوں میں ان کی دو سہیلیاں صرف پاکستان کی ہیں باقی سب دوست ان کے ہندستان میں ہی رہتے ہیں اس لیے اس سرزمین سے ان کا گہرا اور دلی لگاؤ ہے۔ دلی میں ان کا قیام اندرجیت بھیا کے وہاں ہوا۔ لالی چودھری دلی کی تہذیبی وثقافت کی دلدادہ تھیں۔ ایرپورٹ سے اترتے ہی ان کے دیرینہ ساتھی اندرجیت بھیا نے پرتپاک لہجے، بشاشیت سے بھرے چہرے اور چمکتے ہوئے انداز میں استقبال کیا اور بڑے ہی خلوص کے ساتھ اپنی کار سے میرے قیام گاہ تک پہنچایا۔ ایسی محبتیں ایسی وضع داراایاں اس زمانے میں کہاں ملتی ہیں۔ جو اندرجیت بھیا نے آج کی اتنی جدید دلی میں محبت کی تھالی میں پیش کر کے پرانی دلی کی یاد دلا دی۔

ایک صبح ناشتے کے بعد دریا گنج سے روہینی کے لیے لالی چودھری روانہ ہوتی ہیں۔ جہاں وہ ہندستان اور پاکستان کے ملتے جلتے ماحول کی مثال دیتی ہوئی مماثلت ظاہر کرتی ہیں کہ۔ یہاں پر بھی سب کچھ اپنے لاہور جیسا ہے ویسے ہی دھول سے اٹے درخت، ویسی ہی کثیف دھواں چھوڑتی ہوئی بسیں، ویسی ہی پیٹرول ملی گرد کی بو، ویسا ہی جانا پہچانا اجنبی موسم، ویسے ہی مانوس اجنبی راستے وغیرہ یہاں کے موحول کو بھی پراگندہ بنا رہے ہیں۔

اب وہ خسرو، نظام، میر وغالب، درد، کی دلی میں داخل ہورہی تھیں۔ جس کے بارے میں میر نے کہا تھا ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ایک ایک کر کے ان کی نظروں کے سامنے اب پرانی دلی کا وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس کے سیاحت کی وہ منتظر تھیں۔ چناں چہ اپنی یادداشتوں کے جھرونکے سے جھانکتے ہوئے دلی پر ایک نظر ڈالتی ہوئی وہ خود بیان کرتی ہے۔ پرانی دلی قلعے، محلوں، گنبدوں، میناروں، مزاروں، اور مندروں کا وہ شہر ہے، جسے ہر فاتح نے پامال اور تخت وتاراج کر کے اس کی راکھ پہ نئے دلی شہر کی بنیاد رکھی۔ اشوک اعظم سے شاہجہاں تک کیسے کیسے صاحب جلال و جمال شہنشاہ گزر گئے، اس شہر نے مسلمانوں کی عظمت وحشمت کا آغاز بھی دیکھا اور عروج بھی دیکھا اور عبرت ناک زوال بھی۔ 1192 میں وسط ایشیا سے محمد غوری اپنی بہت بڑی فوج لے کر دلی پر حملہ آور ہوا اور پرتھوی راج کو شکست دے کر اسے قتل کر ڈالا۔ قلعہ لال کوٹ پہ قبضہ کر کے اسے جلا کر خاکستر کر دیا اور انڈیا میں پہلی مسجد ''قوت الاسلام'' کی بنیاد رکھی۔ 1398 میں بابر کے جدامجد تیمور لنگ نے دلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ جب مغل فرماں رواشاہ جہاں نے اپنا دارالسلطنت آگرہ سے دلی منتقل کیا تو عروس البلاد دلی دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ شاہی نجومیوں کے کہنے پر 1639 ماہ محرم میں جمنا کے کنارے اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ (تب اس کا نام شاہ جہاں آباد تھا) کہتے ہیں۔ کہ مجرم قیدیوں کو قتل کر کے ان کا خون شہر کی بنیادوں میں ڈالا گیا تھا۔ نو سال تین مہینوں اور کچھ دنوں میں شہر مکمل ہوا تو 1648 میں آگرہ سے مغلیہ سلطنت کی تمام انتظامیہ ہیرے جواہرات سے بھرپور خزانہ اور تخت طاؤس لے کر شاہ جہاں دلی منتقل ہو گیا۔

1739ء میں نادرشاہ کی فوج نے دلی کے ڈیڑھ لاکھ باشندوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور چھ گھنٹے میں شہر کو تہس نہس کر دیا۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات سب لوٹ لیے اور دو ماہ بعد جب نادرشاہ انے وطن لوٹا تو تخت طاؤس اور شاہی ہیرے جواہارت جن میں کوہِ نور ہیرا بھی شامل تھا، اپنے ساتھ لے گیا۔ 1857ء میں برطانوی حکومت نے دلی کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، ہزارہا لوگوں کو بھانسی یا توپوں سے اڑا دیا گیا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے کئی بیٹوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور تین بیٹوں ننگا کر کے زنجیروں میں جکڑ کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اہل دلی کو شہر سے نکال دیا گیا، اگر چہ کچھ عرصہ بعد شہر کے ہندوؤں کو واپس دلی آنے کی اجازت مل گئی

لیکن مسلمانوں پہ یہ پابندی دوسال تک عائدرہی۔ پرانی دلی کی گلیاں گلیاں نہیں مٹی ہوئی تہذیب کے دفینے ہیں اور کوچے کوچے نہیں یادوں کے خزینے ہیں۔

دلی کے لال قلعے کا وہی مقام ہے، جوروم میں Colosseum اور یونان میں Acropolis کا ہے۔ یہ قلعہ شاہ جہاں کے ذوق سلیم اور اسراف کی منھ بولتی تصویر ہے۔ اتنا خوب صورت کہ تعمیر ہوتے ہی اس کا نام قلعۂ معلّٰی پڑ گیا۔ یہاں محلوں کے گرد و نواح سے گزرتی ہوئی نہر بہشت دلی کی دم گھٹنے والی گرم ہوا کو تازگی اور ٹھنڈک بخشتی تھی۔ یہیں پہ وہ حمام تھا جس کا پانی بنا آگ کے ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اس قلعے کا پہلا محل ممتاز محل ہے جو قلعے کا میوزم ہے۔ خاص محل میں سنگ مرمر کے تین کمرے شاہ جہاں کی طعام گاہ، خواب گاہ اور عبادت گاہ تھے۔ دیوان عام میں دربار لگتا تھا، لیکن دیوان خاص قلعے کا دل تھا۔ یہاں شہنشاہ ہند اپنے تخت طاؤس پہ مسند نشیں ہوتا تھا۔ آسمان پہ ستارۂ صبح نمودار ہوتے ہیں موسیقار راگ چھیڑ دیتے اور دلی کی مساجد سے اذان کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ دلی منتقل ہونے کے نو سال بعد یہیں پہ شاہ جہاں کی شاہانہ زندگی زوال پذیر ہوئی۔ جب اس کے متقی بیٹے اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے شاہ جہاں کو آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ یہ وہ نا فراموش کیے جانے والے تاریخ کا زریں باب تھا جس کی فرحت و غم کی ملی جلی بو سے ذہن کو فتگی محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر یہاں کی فضا سے باہر آ کر اندر جیت بھیا سے لالی چودھری نے ''بلی ماران'' چلنے کی فرائش کی تنگ و تاریک بازاروں سے گزرتے ہوئے راہگیروں اور دوکانداروں سے پوچھتے، پوچھاتے کوچۂ غالب میں پہنچے تو ''بلی ماران'' کا محلّہ ''اصفہان دلی'' کہنے والے شاعر کے صحیح الدماغ ہونے میں شبہ ہوا۔ تنگ گلی میں مسمار ہوتے مکان کے ملبے پہ بوسیدہ اور بوڑھے کسان کی طرح خمیدہ دیوار دیکھتے ہوئے میں نے بھیا سے پوچھا، ''یہ ہے غالب کا مکان؟'' تو گلی میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا کہ تھوڑا سا آگے جانے قاسم دروازہ یا حویلی آتی ہے، اس کے اندر مرزا غالب کا گھر ہے۔

اندر جیت بھیا کے ساتھ غالب کے بوسیدہ گھر میں اس کی زندہ و جاوید شاعری کے طغرے جہاں غالبؔ کی مقبولیت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ وہیں ان کی اس خستہ حال عمارت سے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ایسٹ انڈیا کمپنی

سے وظیفہ کی منتظر یہ عمارت غالب کے قرضہ کی طرح تعمیر کا رستہ دیکھ رہی ہو، کچھ گھڑی ٹھہرنے کے بعد الٹے قدم واپس لوٹے۔اندر جیت بھیا نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے سائیکل رکشہ کو بلوایا اور پھر دلی کی شاہی جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔کہتے ہیں کہ یہ مسجد دلی کا مہینہ کا نگینہ ہے۔اوراس کا شمار دنیا کی وسیع وعریض اور عظیم الشان مساجد میں ہوتا ہے۔جب اورنگ زیب عالمگیر آراستہ ہاتھی پہ سوار ہو کر جامع مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھتے جاتا تھا تو سڑک کی گرد بٹھانے اور گرمی کم کرنے کے لیے سڑک پہ خوب چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔جب ہم مسجد کے قرب وجوار میں پہنچے تو دونوں وقت گلے مل رہے تھے۔مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔مسجد جانے والی سڑک پہ پولیس کے سپاہی جسے چاہتے روک لیتے، جسے چاہتے گزرنے دیتے۔اتنا بے پایاں ہجوم دیکھتے ہوئے دم گھٹا جارہا تھا۔نمازی تیز تیز قدم اُٹھاتے مسجد کی طرف رواں تھے۔دھد لی زرد روشنیوں، شیشے کے دریچوں، چوبی دروازون اوراونچے چوپاروں کی ممٹیوں کو چھوتی ہوئی مغرب کی اذان فضا میں گونجنے لگی:

حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ

حی علی الفلاح حی علی الفلاح

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے مؤذن نے اذان ختم کی، تو اس پراسرار اور دلگیر لمحوں سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دلی رحمتِ خداوندی کے حصار میں آ گئی تھی۔بعدازاں اندر بھیا کے ہمراہ چاندنی چوک کی جانب کا وہ رواں دواں ہوئیں۔چاندنی چوک شاہ جہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا نے تعمیر کروایا تھا، اور یہ پرانی دلی کا تجارتی مرکز تھا۔یہاں سڑک کے درمیان سے نہر بہتی تھی، جس کے دونوں طرف ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے جامن، انار اور آم کے درخت تھے، بازار میں چم چم کرتی تاجروں کی دکانیں تھیں اور سرسبز وشاداب درختوں میں گھری ہوئی امرا اور رؤسا کی اونچی دیواروں منقش دروازوں اور محراب دار جالیوں سے آراستہ خوش نما حویلیاں تھیں۔1663 میں فرانسیسی سیاح Francois Bernies نے چاندنی چوکو کو دینا کی خوب صورت ترین شاہراہ قرار دیتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ''پیرس میں اس جیسی سڑک ہونی چاہیے''۔

چاندنی چوک طرف جاتے ہوئے انھیں یوں لگا رہا تھا جیسے تاشقند اور فرغانہ سے آئے ہوئے تاجروں کے مال واسباب سے لدے اونٹ قطار در قطار وہاں کھڑے ہوں گے اور ہوا میں چین کے ریشم کی سرسراہٹ اور مڈگاسکر کی دارچینی کی مہک رچی ہوگی، مالدیپ کے جوہری سچے موتیوں کے جھمکے، کنگن اور رانی ہار بیچ رہے ہوں گے۔ لیکن صدیوں کی مسافت طے کرتے ہوئے جب میں چاندنی چوک پہنچی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اور چاندنی چوک پہ اور ہی زمانہ تھا۔ مسمار ہوتی دکانیں، شکستہ کٹہرے، ٹوٹے پھوٹے گودام، ٹریفک جام، کثیف دھواں میونسپل Urinals سے آتی ہوئی ایمیونیا کی بدبو کے بھبکے، لوگوں کا اژدہام، موٹر سائیکل اور رکشوں کی بھرمار تھی، وہ بھیڑ بھڑکّا، وہ شوروغل کاالاماں الاماں، ایک ہاکر گھنٹی بجاتے ہوئے اپنی پوری قوت سے چلاّ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس جم غفیر میں انھیں مغل ولی عہد شہزادہ داراشکوہ کا ژولیدہ خاطر چہرہ نظر آیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں تخت پہ قبضہ کرنے اور اپنے باپ شاہجہاں کا آگرہ کے قلعہ میں نظر بند کرے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے بڑے بھائی داراشکوہ کو جو مختلف اور متنوع علوم پہ عبور رکھنے میں یکتائے روزگار تھا، ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر غلاظت سے لتھڑے مریل ہاتھی پہ بیٹھا کر چاندنی چوک میں اس کا ذلت آمیز جلوس نکالا تھا۔ وہ سوچتی ہیں کہ کہ دہلی شہر اور دہلی شہر کی باشندوں پہ کیسے کیسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے۔ اس پہ کیسے کیسے پرآشوب زمانے آئے کبھی اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی غیروں کی بدولت اور سب قیامتیں سہہ کر دہلی آج تک زندہ وتابندہ ہے، تبھی تو جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ:

‘‘We face good and bad of India in Delhi’’

چاندنی چوک سے واپس ہوتے ہوئے اندر بھیا ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں!‘‘یہ ہلدی رام مٹھائی کا شوکیس ہے، یہاں سموسوں کی روزانہ کی سیل دولاکھ روپے کی ہے اور دیوالی کے دن مٹھائی کی سیل 65لاکھ روپے کی تھی۔

راج گھاٹ میں مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پہنچتی ہیں ان کی آخری آرام گاہ بھی ان کی زندگی کی طرح سادہ تھی۔ ایک طرف گھاس کے قطعہ پہ نیم دائرے میں بیٹھی ہوئی عورتیں چرخوں پہ روئی کات رہی تھیں۔ کوئی دوکیشنل

کلاس لگتی تھی اور سونیئر شاپ سے کتھا کے بھجن کی آواز آ رہی تھی، یہ سب کچھ اتنا عظیم اور قدیم لگ رہا تھا۔ گاندھی جی سمادھی سے نکل کر پھر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ گلیوں، مسجدوں اور مندروں کے کونوں میں پڑے ہوئے بھوک سے نڈھال لوگوں کو دیکھ کر اس ولی اللہ کے حلق سے نوالہ نہیں اُترتا تھا۔ کھانے پینے کی جو اشیا انھیں ملتی وہ بنا اس امتیاز کے کہ یہ مفلس و نادار لوگ مسلم تھے یا ہندو و جین تھے، یا بدھ مت کے پیروکار، سب میں یکسانیت بانٹ دیتے۔ حضرت خواجہ نظام الدین یہ درس دیتے تھے کہ ہر قوم کا اپنا مسلک، اپنا مذہب اور اپنا طریقۂ عبادت ہوتا ہے۔ غیر مسلم لوگوں میں وہ محض اپنی رواداری کی وجہ سے ہی مشہور نہیں تھے، بلکہ ان کی تعلیمات میں ہندو، بدھ مت اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذہب کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ تبھی تو چھ سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود ہزاروں مسلم، ہندو سکھ اور عیسائی اپنے مادّی اور روحانی معاملات کی راہنمائی کے لیے ہر جمعرات کو ان کے مزار پہ حاضر ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کو عقیدت اور عجز و انکسار سے دعائیں مانگتے۔

رات کو پھر کیول سوری صاحب اور اندر جیت بھیا کے دوست کی بیٹی کی شادی میں شرکت کی۔ اندر بھیا اور بھابی سدھا نے وہاں اکثر دوستوں اور شناساؤں سے متعارف کروایا۔ شادی سے فراغت پا کر دہلی سے ڈرائیور کے ساتھ آگرہ کی طرف ہو گئیں۔ اب آگرہ کا دلربا منظر سامنے تھا۔ کہتی ہیں میں نے آنکھیں مل مل کر جھپک جھپک کر دیکھا لیکن جو آگرہ مجھے نظر آیا وہ دھول، دھوئیں اور گرد و غبار اٹا ہوا تھا۔ ہریالی اور صفائی کا کہیں نام و نشاں تک نہ تھا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ریشم جیسی ہموار سڑک تاج محل تک جاتے جاتے کسی دور افتادہ گاؤں کو جانے والی Bumpy Road بن گئی۔ بات ساری یہ ہے کہ ہندستانی حکومت اسلامی تاریخی مقامات محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کر کے ہر بات سے بری الذمہ ہو گی ہے اور محکمۂ آثار قدیمہ نے سڑکوں اور عمارتوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا ہے۔ تاج محل سے کچھ فاصلے پر کاریں روک دی گئیں اور تاج محل کا دیدار کرنے والوں کو انتظامیہ اپنی برقی بس میں اندر لے گئی۔

سرخ راہداری سے داخل ہوتے ہوئے نظروں کو خیرہ کر دینے والی سفیدی کے بعد دُنیائے محبت کی اس عظیم الشان اور بے نظیر یادگار کی پوری شان و شوکت فوکس میں آتی ہے۔ رسالوں، اخباروں میں چھپنے ولای تصویریں اور

فلموں میں دکھائے جانے والے سین اس کی دلکشی اور حسن جمال کے ساتھ جسٹس نہیں کرتے۔ 1631 میں چودھویں بچے کی پیدائش پر اکتیس سالہ ممتاز محل کی زندگی کا چراغ گل ہو جانے پر انھیں پشیمانی اور حزن و یاس کو مثبت پہلو دے کر شاہ جہاں نے اپنی ساری توجہ اس کے مقبرہ بنانے کی طرف مبذول کر دی۔ 1632 میں کام شروع ہوا اور بیس سال تک بیس ہزار مزدور اور کاریگر اس کی تعمیر میں مصروف رہے۔ نامور مصور ولیم حاجز نے دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے والی اس خوب صورت ترین عمارت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:

"Like the most perfect pearl on an azure ground."

انڈیا کے تاریخی مقامات اور کلچرل بدہضمی کا شکار امریکن فرسٹ لیڈی ایلنکو ر روز ویلٹ جب آگرہ پہنچی تو تاج محل کے بارے میں اس کے یہ تاثرات تھے:

"میں اپنی سانس روک لی، اتنی بے پایاں خوب صورتی کے سامنے میری زبان گنگ ہوگئی، یہ وہ خوب صورتی ہے جو روح میں سما جاتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے علم نہیں تھا کہ Perfect تناسب کسے کہتے ہیں"۔

لالی چودھری نے تاج محل کا نظارہ کر کے بے ساختہ Pure Perfection کے الفاظ ان کی زبان پر آ گئے کہ اتنی شفاف اور حسین عمارت ہے۔ وہ فرش سے شغف تک ان میناروں، محرابوں اور دیواروں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی ایک ایک تفصیل ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر رہی تھی۔ اس کا ہر زاویہ ہر پہلو اپنے دل پہ نقش کر رہی تھی۔ راہداری سے داخل ہوتے ہی دروازے پہ 89ویں سورۃ الفجر کی قرآنی آیتیں:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّة. ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ.

تاج محل کے ایک جانب سنگ احمر کی مسجد ہے، اور دوسری طرف احمریں مہمان خانے۔ ممتاز محل اور شاہ جہاں کے مقبرے ایوانِ مثمن میں ہیں۔ شاہ جہاں کے حسن خیال اور ذوقِ جمال کی داد دیتے ہوئے جب وہ جمنا کی طرف جاتی ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ "Taj Mahal exceeds the sum of its inspiration" ہے۔ جمنا کے سیاہی مائل پانی کے پیش نظر سنگ مرمر کا تاج کوئی ماورائی چیز لگتا ہے۔ وہ کبھی

مرمریں تاج محل کو دیکھتیں اور کبھی آب نوسی جمنا کو۔اس کے آگے کا سفر وہ قلعہ بھی دیکھنا تھا جہاں شاہ جہاں نے اپنے زندگی کے آخری سال نظر بندی میں کاٹے تھے۔سو تاج محل کو خدا حافظ کہہ کر وہ قلعۂ آگرہ پہنچتی ہیں۔ جہاں سے مغلیہ سلطنت کا آغاز بھی اور یہیں سے اختتام ہوا تھا۔ 1526 میں ابراھیم لودھی کو شکست دینے کے بعد بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو خزانہ سنبھالنے کے لیے آگرہ بھیجا۔ ہیرے جواہرات کے ساتھ یہیں پہ اسے گولف بال سائز کا ہیرا کوہ نور ملا، جس کی قیمت بابر کے الفاظ میں یہ تھی۔''یہ ہیرا بیچ کر دنیا کے تمام لوگوں کو ڈھائی دن کی خوراک مہیا کی جاسکتی ہے''۔ممتاز کی وفات کے آٹھ سال بعد شاہ جہاں نے نئے دلّی شہر کی (جواب پرانی دلّی کہلاتا ہے) بنیاد رکھی اور 1648 میں اپنا دارالسلطنت دلّی منتقل کیا۔ 1658 میں اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے شاہ جہاں کو ممتاز محل کے رہائش گاہ قصر خود جو مثمن برج بھی کہلاتا ہے، قید کر دیا۔اس سے قطع نظر کہ صوم وصلوٰۃ کا پابند اور متقی و دیندار ہوتے ہوئے اس نے اپنے عظیم باپ کو بڑھاپے میں نظر بند رکھا اور اپنے بھائیوں خصوصاً ذہین وفطین ولی عہد شہزادے داراشکوہ کو جو نسلی اور مذہبی تعصب کا سخت مخالف تھا، قتل کروایا اس لیے کہ یہ معاملہ تخت وتاج کا تھا اور عشق خواہ اللہ کا ہو یا عورت اور تخت وتاج کا ہو، عشق ہی ہوتا ہے اور بالکل اندھا ہوتا ہے۔اورنگ زیب کو تخت وتاج سے عشق تھا، لہٰذا اُس نے اپنے بڑے بھائی دارا کو قتل کر کے اس کا سر طلائی ڈبّے میں بند کر کے اپنے خواجہ سرا اعتبار خاں کے ہاتھ آگرہ روانہ کر دیا۔

سیر آگرہ کو خیر آباد کہتے ہوئے لالی چودھری اب اپنے رخت سفر کو جاری کرتے ہوئے فتح پور سیکری پہنچیں۔ فتح پور سیکری کا شمار دنیا کے ویران ترین شہر میں ہوتا ہے، اسے مغل شہنشاہ اکبر نے تعمیر کروایا تھا۔ 26 سالہ شہنشاہ اکبر کو حکومت کرتے بارہ سال ہو گئے تھے، لیکن ابھی تک اپنی سلطنت کے جانشین سے محروم تھا۔ چتوڑ کے راجہ کو شکست دینے کے بعد وہ ننگے پاؤں چل کر خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پہ حاضر ہوا اور وہاں عجز وانکسار سے تخت کے ولی عہد کی دُعا مانگی۔رات کو اکبر نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ معین الدین اُسے ایک بقید حیات بزرگ شیخ سلیم چشتی کے پاس جانے کی ہدایت دے رہے تھے۔اکبر شیخ سلیم چشتی کے پاس آئے اور ان سے دُعا کی درخواست کی۔شیخ سلیم نے

اُسے تین بیٹوں کی بشارت دی۔ اگلے سال کی راجپوتی بیوی جودھابائی کے بطن سے ولی عہد شہزادہ پیدا ہوا، جس کا نام جس کا نام شیخ سلیم کے نام پہ رکھا گیا۔ 1570 میں دوسرا بیٹا مراد اور 1572 میں تیسرا بیٹا دانیال پیدا ہوئے۔ تو بشارت پوری ہونے پہ اکبر نے شیخ سلیم چشتی کی جائے رہائش پر ایک نیا شہر بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کا نام فتح پور رکھا۔ بارہ سال تک یہ شہر علماء، فضلا، دانش ورون اور فن کاروں کی آماجگاہ رہا۔ 1585 میں اکبر نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو یہ شہر ویران ہو گیا۔ ایک طرف ہرن مینار ہے جہاں مسافروں کی رہنمائی کے لیے رات پھر چراغ روشن رہتا تھا۔ سب سے بڑا محل جودھا بائی کا محل ہے، اسے شبستان اقبال بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہی دروازے سے ہوتے ہوئے وہ وسیع و عریض جامع مسجد میں داخل ہوتی ہیں۔ جس میں عظیم الشان مسجد کی سنگ تراشی قابل دید ہے، کہتے ہیں کہ ایسی خوش نما مرقع کاری اکبری عہد کی کسی اور عمارت میں نہیں۔ مسجد کے ایک طرف سلیم چشتی کا مرمریں مقبرہ ہے، جس کی جالی کی تراش بہت منفرد اور بے نظیر ہے۔

آگرہ اور فتح پور سیکری سے واپسی کے اگلے دن اندر جیت بھیا کے ساتھ قطب مینار دیکھنے جاتی ہیں۔ جو سرخ اینٹوں کا بنا ہوا یہ دوسو چونتیس فٹ اونچا مینار ہندستان کے قدیم ترین تاریخی مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد 1199ء میں قطب الدین ایبک نے رکھی تھی۔ قطب مینار کے کمپاؤنڈ میں ایک اور عجوبہ چوبیس فٹ اونچا آہنی ستون ہے، جو ایسی ہنرمندی اور مہارت سے بنایا گیا ہے کہ پندرہ سوسال سے باہر کی کھلی ہوائیں ایستادہ ہونے کے باوجود اس پہ کہیں زنگ کا نام و نشان نہیں۔

لالی چودھری کی تاریخ سے دلچسپی ہے۔ اس لیے وہ جانتی ہیں کہ دلّی کیسے کیسے پُر آشوب حالات سے گزری۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ کبھی اپنوں اور کبھی غیروں کی بدولت اور سب قیامتیں سہہ کر بھی دلّی آج تک زندہ اور تابندہ ہے۔

چواس سفرنامے میں لالی چودھری نے ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی روح کشید کی ہے۔ ہندستان اور خصوصاً پنجابیوں کی مہمان نوازی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ لالی چودھری کی بے پناہ صلاحیت کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی حافظے کی مالک ہیں اور اپنی کہانیاں لفظ لفظ زبانی سنانے پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان کی یادداشت فوٹوگرافک ہے۔

سفرنامہ ''خیاباں خیاباں اِرم''

''خیاباں خیاباں اِرم'' لالی چودھری کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ جس میں انھوں نے پیرس کی سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ چناں چہ پیرس کے رومانوی چوک اور حویلیاں، عظیم الشان گلستان، خوش نما کشادہ سڑکیں، دل نشیں سیر گاہیں اور خوب صورت ریستوران سارے یورپ میں بے مثال ہیں۔

لالی چودھری پیرس کی سیاحت کے ارادے کو اس طرح بیان کرتی ہیں، کہ ایام جوانی لاہور رہتے ہوئے بانورا دل پیرس کے بجائے دلی اور آگرہ جانے کو مچلتا تھا۔ جب یہ دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوگئی تو وسط اکتوبر میں رابنسن مے ڈیپارٹمنت اسٹور سے سینڈل خریدتے ہوئے یونہی اچانک پیرس جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہوا یوں کہ اسٹور میں رکھی ہوئے cute سے واکنگ شوز پہ نظر پڑ گئی۔ گو کہ خوب صورت شوز اور ہنڈ بیگ میری کمزوری ہیں، پھر بھی میں نے اس خریداری سے خود کو روو کنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ لاس اینجلس میں ان شوز کا کوئی مصرف نہیں، تب اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ یہ واکنگ شوز پہن کر کے پیرس کی کوچہ گردانی کی جائے۔ لہذا گھر آتے ہی اپنے ٹریول ایجنٹ کو کال کر کے پیرس کی فلائٹ اور ہوٹل کا بندوبست کیا اور ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر شہر نور اور شہر سرور روانہ ہوگئی۔

لاس اینجلس ایئرپورٹ سے فلائٹ میں سوار ہو کر پیرس پہنچی۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلی تو صبح کی ٹھنڈی ہوا میں ٹھٹھرا ہوا پیرس بادلوں کی سرمئی فرغل اوڑھے بڑی کسل مندی سے آنکھیں مل رہا تھا۔ لیکن گہرے سرمئی بادلوں کی رِدا میں لپٹے ہوئے پیرس کے سرد ہوا سے لال ہوتے ہوئے گال بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ان کے لیے کیب کا انتظام کر رکھا تھا۔ جیسے ہی کیب ایئرپورٹ کی حدود سے نکلی، بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشوں پہ ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ جالی دار محرابوں سے آراستہ فرنچ Vanilla رنگ کی عمارتیں اور ہوا میں اُڑتے ہوئے زرد نارنجی پتے بہت دل فریب لگ رہے تھے۔ میٹرو سے بڑھیا اور کوئی سسٹم نہیں۔ کیمرہ گلے میں ڈالتے ہوئے دروازہ بند کیا اور فیشن کے مکہ، کون کورڈ طیارے اور ایک سو اسّی میل فی گھنٹہ رفتار کی ریل گاڑی کے پیرس کی

یاترا کے لیے لا ڈیفنس میٹرو اسٹیشن پہنچ گئی۔ پیرس کے اس انڈر گراؤنڈ میٹرو سسٹم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی دارالحکومت کا کوئی اور ادارہ اس کے مماثل نہیں۔عوامی ٹرانسپورٹیشن کا یہ ادارہ دو نظاموں پہ مشتمل ہے۔ایک میٹرو جو ہر اسٹیشن پر رکتی ہے۔دوسرا Re Rs ہے جو ایکسپریس ہے۔کوئی بھی میٹروں اسٹیشن کسی بھی جگہ سے دس منٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔اس زمین دوز میٹرو کی تعمیر 1898 میں شروع ہوئی اور ساڑھے چھ میل لمبی ریلوے لائن کا افتتاح 19 جولائی 1900 میں ہوا تو پہلے سال پندرہ ملیئن سے زیادہ لوگوں نے اس میں سفر کیا۔ گذشتہ ایک صدی میں اس کی اتنی توسیع ہوئی کہ تین سو ستر اسٹیشنوں پر مشتمل پندرہ پٹریوں کے ریلوے لائن کی طوالت ایک سو چوبیس میل ہے۔اسے یورپ کا سب سے ارزاں اور efficeient سسٹم تسلیم کیا جاتا ہے۔روزانہ ساڑھے تین ملیئن لوگ اس پہ سفر کرتے ہیں۔عوام کے سفر کو خوش گوار بنانے کے لیے میٹرو کی انتظامیہ زمین دوز اسٹیشنوں پر فوٹوگرافی کی نمائشیں،فیشن شو،موسیقی اور دیگر کئی قسم کے کلچر پروگرام منعقد کرتی ہے۔میٹرو کی راہداریاں سبز رنگ کی آہنی سلاخوں سے بنی ہوئی ہیں،جن پہ سبزیوں کی سادہ موتیف بہت خوش نما لگتی ہے۔بالآخر شانز دے مارز کے اسٹیشن پر اتر گئیں، یہ علاقہ پیرس کا قدیم تاریخی شہر ہے اوور پونے آٹھ مربع میل پہ محیط ہے۔پورا پیرس تو اتنا وسیع وعریض ہے کہ اپنے مضافات سیمت چھ سو پچانوے مربع میل پہ پھیلا ہوا ہے۔دریائے سین کے کنارے آباد ہونے والے کاشت کاروں اور تاجروں کے ایک قبیلے Parisi نے پانچ سو قبل مسیح میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔53ق م میں روم نے اس پہ قبضہ کرتے ہوئے لوتیشیا نام رکھ دیا۔508 میں کلووس اول نے اسے فتح کر کے فرانکس سلطنت کا دارالخلافہ قرار دیا تو اس کا نام پیرس رکھا۔سو سالہ جنگ کے دوران برطانیہ نے فرانس پہ اپنا تسلط جما لیا تھا۔ 1436 میں برطانیہ کو شکست فاش دے کر فرانسس اول تخت نشین ہوا تو اس کے زیر اقتدار پیرس کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔اور پیرس تہذیب وتمدن،اسلوب فکر اور فنون لطیفہ کی آماجگاہ بننے لگا۔اسے کلاسیکل حیثیت لوئی چہارم دہم کے عہد حکمت میں عطا ہوئی۔لوئی نے تیرہویں صدی کی دیواریں مسمار کروا کر وسیع شاہراہیں،خوش نما حویلیاں،عظیم الشان ورسائی محل اور خوب صورت باغات تعمیر کرواتے ہوئے پیرس کو تمام دنیا کے لیے ماڈل اور خواب نگر بنا دیا ہے۔

لالی چودھری فرانسیسی کی زمین میں آ کر محو ہیں وہ اس وقت دنیا کو کلاسیکل فرانسیسی طباخی سے لیکر فرانسیسی خطاطی اور فرانسیسی مے سے لیکر فرانسیسی بوس و کنار عطا کرنے والے پیرس میں کھڑی تھیں اور ستائشی نظروں سے اپنے گردوپیش کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کس تاریخی عمارت زیارت سے اپنی پیرس بینی کا آغاز کروں۔

بس میں فرنچ ،انگلش ، ہسپانوی ، جرمن اور اطالوی زبان مین کمنٹری کا انتظام تھا۔ یوں تو پیرس میں سینکڑوں قابل دید جگہیں ہیں،لیکن آئیفل ٹاور صرف قابل دید ہی نہیں بلکہ اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔لہٰذا وہ آئیفل ٹاور کے بس اسٹاف پہ اتر جاتی ہیں۔دریائے سین کے بائیں جانب ڈھائی ایکڑ پر محیط ایک ہزار فٹ بلند ٹاور جس کی بلندی گرمیوں میں مزید چھ انچ بڑھ جاتی ہے،فرانسیسی انقلاب کے سوسالہ جشن کے موقع پر عالمی میلے کی نمائش کے لیے لیگز ینڈر، جی آئیفل نے تعمیر کیا تھا۔اس کا وزن گیارہ ہزار ٹن ہے اور دوسو، چار سو اور نوسوفٹ کی تین منزلوں پہ منقسم ہے۔ ہر منزل پہ ریستوران اور مے خانہ موجود ہے۔نچلا حصہ وسیع محرابوں پہ مشتمل ہے۔اس کی تکمیل کے پہلے ہفتے تیس ہزار لوگ نوسوفٹ کی بلندی پہ گئے تھے اور ابتدائی چھ ماہ میں یہ تعداد دوملیئن تک پہنچ گئی تھی۔ بردشر پڑھتے ہوئے وہ آئیفل ٹاور کی طرف بڑھنے لگی جو دور سے اچھا اور قریب سا لگتا ہے۔وہاں سرد ہوا کے جھونکوں سے یہ سہ پہر ٹھٹھری ہوئی تھی۔آئیفل ٹاور بدصورت اور اپنے خالق کی کور بینی کا مظہر لگنے لگا۔ٹیڑی میڑھی آہنی تاریں اور سلاخیں، نہ اس میں تاج محل کی دل ربائی تھی، نہ لال قلعے کی دلکشی، نہ سنگ مرمر کی ٹھنڈک ، نہ سنگ احمر کی حدت، نہ مرصع دیواریں، نہ منقش در و بام۔بس روشنی کا ایک شہر آباد ہونے کے علاوہ وہاں کچھ اور نئی چیز نہیں آ رہی تھی جس کو ہم قابل رشک و نظارہ کہہ سکیں۔پھر وہاں سے وہ لفٹ سے تیسری منزل پہ پہنچیں اور پھر وہ باہر نکل کر نوسوفٹ کی بلندی سے پیرس اور دریائے سین کو دیکھنے لگیں۔ مطلع ابر آلود نہ ہوتو یہاں سے چالیس پچاس میل تک کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے، بنا لفٹ کے اگر تیسری منزل تک جانا ہوتو ایک ہزار چھ سو باون زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں سے نظارہ اتنا دلکش تھا کہ نیچے اترنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

اس کے بعد لالی چودھری Saint Germain des Pres آ گئیں۔رومن عہد سے آٹھویں صدی

عیسوی تک یہ علاقہ کھلا میدان تھا، اور سینٹ آرچین کلیسا کی جگہ پر مصری دیوی آئسز کا معبد واقع تھا۔ (نئے مضافاتی علاقے Moulineaux Issy les کا نام اسی قدیم معبد سے منسوب ہے) ہر سال عید نہار کے بعد یہاں سے لے کر لکسمبرگ باغ تک بہت بڑا میلا لگتا تھا، جس میں نہ صرف فرانس کے دور نزدیک سے بلکہ اسپین، انگلینڈ اور روم تک سے عمائدین مملکت منصب دار سوداگر مطرب اور طلبا شامل ہوتے تھے۔ لالی چودھری کا خیال ہے کہ فرانسیسی لوگ غیر ملکی زبانیں سمجھنے کے بارے میں بہت کاہل ہیں۔ وہاں سے روانہ ہو کر راستے میں وہ Etoile چوک پہ اتریں۔ اس وسیع گول چوک سے نکلتی ہوئی بارہ شاہراہیں بہت بڑے ستارے کا عکس پیش کرتی ہیں۔ اسی مناسبت سے چوک کا نام Etoile ہے۔ چوک کے وسط میں محراب فتح Arc de Triomph ہے، جو فرانسیسی افواج کی فتوحات کے اعزاز میں تعمیر کی گئی تھی۔ 1806 میں نپولین نے اس کی تعمیر کا حکم صادر کیا تھا، محراب 164 فٹ بلند اور 148 فٹ چوڑی ہے۔ سنگ مرمر کی دیواروں پہ فرانسیسی افواج کی ررو انگی، ان کی فتوحات اور واپسی کی مجسمہ سازی ہے۔ محراب کے اندرونی حصے میں چھ سو ساٹھ جرنیلوں اور سو سے زائد جنگوں کے نام رقم ہیں۔ زیر محراب پہلی جنگ عالمگیر میں مرنے والے ایک گمنام سپاہی کی قبر ہے جس پہ ہمیشہ دیا جلتا رہتا ہے۔ اور ہر شام قبر پہ تازہ پھول رکھے جاتے ہیں۔ رومۃ الکبریٰ کے رسم و رواج کی پیروی میں ملکی اور غیر ملکی تمام فاتح افواج اس محراب سے گزرتی رہی ہیں۔ اہم تقریبات کے جلوس بھی یہاں سے گرزتے ہیں۔ 1944 میں فرانس کو آزادی دلانے کے بعد اتحادی فوجی دستے بڑے کرّ و فر سے مارچ کرتے ہوئے اس محراب سے گزرتے تھے۔ اپنی جلاوطنی کے دوران نپولین اس کی تکمیل سے پہلے ہی سینٹ ہلینا میں مر گیا تھا۔ اس کی لاش کی واپسی تک محراب مکمل ہو چکی تھی، اس کا جنازہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس محراب سے گزرا تھا۔ محراب کے ایک طرف فرانس کے بادشاہ لوئی شانزدہم اور اس کی ملکہ ماری این ٹوینٹ کی یاد میں کتبہ نصب ہے۔ یہاں سے نکل کر لالی چودھری نے بس لی اور Place de la Concorde آ گئیں۔ اکیس ایکڑ پر محیط یہ چوک دنیا کے انتہائی خوب صورت چوکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے وسط میں بہتر فُٹ اونچا اور دو سوٹن وزنی سوئی کی شکل کو ستون Obelisk of Luxor نصب ہے جو مصر میں معبد

لکسور سے برآمد ہوا تھا۔ یہ ستون تیرہ سو قبل مسیح کا ہے۔ چوک میں دو عظیم الشان فوارے اور آٹھ دیدہ زیب مجسمے تھے۔ یہ مجسمے فرانس کے آٹھ بڑے شہروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انقلاب فرانس سے پہلے یہ لوئی پانزدہم کا محل تھا۔ انقلاب کے دوران اس کا نام ایوانِ انقلاب پڑ گیا اور سر قلم کرنے کی عفریتی مشین یہاں نصب کر دی گئی جسے تین آدمی Operate کرتے تھے۔ ایک آدمی گردن پر بلیڈ چلاتا تھا، دوسرے کے ہاتھ میں بریدہ سر سے ٹپکتا خون جمع کرنے کے لیے بالٹی تھی اور تیسرا آدمی مقتول کا کٹا ہوا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر خوشی سے نعرے لگاتے اور اور تالیاں بجاتے ہوئے انقلابیوں کے ہجوم کو دکھاتا تھا۔ یوں تو اس چوک میں بہت سے تاریخی واقعات ظہور پذیر ہوئے لیکن ان میں سب سے المناک واقعہ بادشاہ فرانس اور اس کی ملکہ کا سر قلم ہونا تھا۔

لالی چودھری چوک کے بعد شانزلے لیزے روانہ ہوئیں۔ شانزلے لیزے صرف پیرس کا نگینہ ہی نہیں اسے دنیا کی خوب صورت ترین شاہراہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ پلاس کون کورڈ (ایوان اتحاد) سے مغراب فتح تک تین میل لمبی اس شارع پہ خراماں خراماں چہل قدمی کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا عیدالفطر پہ شیر خورمہ کھانا۔ اس خوب صورت شاہراہ کے دونوں جانب لہلہاتے درخت، اسٹائلش اسٹور، عالی شان ریستوران، جگمگاتے شوروم، مسقّف رہداریاں، سجل نشست گاہیں، نظر و دل کو نہال کر دیتی ہیں۔ پھر وہ لنچ کے لیے ایک ریستوران میں داخل ہوئیں۔ جس کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگیں، اندرونی تزئین کاری بہت خوب صورت تھی۔ دیواروں پہ آویزاں Paintings and Tapestry کی بدولت ریستوران کے بجائے میوزیم لگ رہا تھا۔ بعدازاں شاپنگ مال کی طرف رخ کیا اور وہ پیرس کی خاص الخاص شاپنگ اسٹریٹ Montaigne Ave آ گئیں، جہاں اسٹوروں سے ملبوسات خریدنے کے لیے appoinment کی ضرورت ہوتی ہے اور معمولی اسکرٹ اور جیکٹ کی قیمت تین ہزار ڈالر سے کم نہیں تھی۔ شانزے لیزے کے مخالف سمت میں گراندے آرم ایونیو ہے جو لاڈیفنس کے فلک بوس نواحی علاقے میں لے جاتا ہے۔ ڈیفینس کی محراب اتنی وسیع و عریض ہے کہ اس کے نیچے پیرس کا نوتر دام کلیسا نصب کیا جا سکتا ہے۔ گراندے ایونیو سے سرسبز درختوں اور زمردیں گھاس کے قطعوں سے آراستہ بڑی وسیع شاہراہ

foch Ave نکلتی ہے۔ یہ پیرس کا متمول ترین علاقہ ہے، یہاں یونانی ارب پتی اوناسیس اور سابقہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے دولت کدے ہوا کرتے تھے۔ اپنے کیوٹ آرام دہ شوز میں گرد وپیش سے محظوظ ہوتی ہوئی وہ گلستان Jarden des Tuileries پہنچیں، جو شہر کے شور شرابے میں سکون کا نخلستان ہے اور پیرس کے عظیم الشان پارکوں میں شمار ہوتا ہے۔ کیتھرین نے 1564 میں جب اپنا محل تعمیر کروایا تو ٹائلوں کا یہ بھٹہ گلشن میں بدل گیا۔ سوسال بعد ورا سائی محل کے معمار Le Notre نے اس گلشن کو واضح اور خوب صورت خدوخال عطا کرتے ہوئے سرسبز گھاس کے اطراف میں جیومٹری اشکال کے قطعوں کو رنگ برنگ پھولوں سے مزیّن کر کے خوش نما مجسموں سے مزید دل نواز بنا دیا۔ گلشن کی مثمن جھیل میں دریائی مخلوق کے مجسمے ہیں۔ یہاں سے شانزے لیزے اور کون کورڈ چوک کا نظارہ بہت دیدہ زیب ہے۔

سفر کی مسافت کو مختصر کرتے ہوئے انھوں نے سوچا کہ ہسٹری کے شائقین کو اتنے مختصر Tour پہ نہیں آنا چاہیے۔ وقت کی قلّت پہ افسوس کرتی ہوئیں وہ اس محل کے سامنے کھڑی ہوگئیں جس کے دروازے پہ ''حریت، مساوات اور اخوت'' کے الفاظ کنندہ تھے۔ لوئی نہم کے عہد میں یہ محل شاہی رہائش گاہ تھا۔ جب لوف شاہی مسکن بنا تو یہ محل پارلیمنٹ بلڈنگ میں بدل گیا۔ 1793 انقلابی عدالت نے اسے انصاف محل کا نام دیا، اس محل کا شمالی حصہ جو Conciergerie کہلاتا ہے۔ شاہی افسروں کی رہائش گاہ تھا۔ سولہویں صدی میں اسے جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور بادشاہانِ وقت اپنی حکومت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرنے والے سرکشوں وار باغیوں کو یہاں بہت اذیت رسانی سے قتل کرتے تھے۔ پانسہ پلٹنے پہ انقلابی لیڈروں نے بھی اس محل کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ انقلاب کے دوران شاہ فرانس لوئی شانزدہم اور ملکہ ماری این ٹونیٹ سمیت ہزاروں لوگوں کو یہاں محبوس رکھا گیا تھا۔ راہداری کے نواحی گنبد کو Babbler کا نام اسی لیے دیا گیا تھا کہ وہاں سے اذیت خوردہ قیدیوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ سر قلم کرنے کے لیے یہاں سے چھبیس سو قیدیوں کو چھکڑوں میں بھر کر لایا گیا تھا۔

نوتر دام کلیسا، لالی چودھری نے اگلی صبح ناشتے کے بعد ٹرین سے Etoile اور وہاں سے چر چل ایونیو کا سفر

کیا۔ جہاں Petit Palais قیصر خورد اور Grand Palais قصر عظیم واقع ہیں۔ یہ دونوں محل 1900 میں عالمی میلے میں نمائش کی غرض سے بنائے گئے تھے، چھوٹا محل انیسویں صدی کے آرٹ کے لیے مخصوص ہے اور قصر عظیم میں طرح طرح کی عارضی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔ وہاں سے پوچھتے پوچھتے وہ Rue Jacob اور بعد ازاں زو دانتے پہنچیں۔ روجیکب حضرت یعقوب کے نام سے منسوب ہے۔ ہنری چہارم کی عالی نسب خوب صورت اور تعلیم یافتہ ملکہ مارگو نے جس کی رنگین زندگی نے اس علاقے کی تاریخ پہ اپنے بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں، خود سے کیا ہوا عہد نبھاتے ہوئے یہ سڑک اور معبد تعمیر کروایا تھا۔ اگر چہ ہنری چہارم کی اپنی چھپّن داشتائیں تھیں لیکن اپنی ملکہ مارگو کے معاشقے وہ صرف پندرہ سال تک ہی برداشت کر سکا اور اسے شاتو اوسوں میں نظر بند کر دیا۔ گو کہ وہ وہاں بھی رنگ رلیاں مناتی رہی لیکن اس کے ذہن سے پیرس کبھی محو نہ ہو سکا۔

Rue Dante جو کالج آف نیشن کہلاتی تھی، قرون وسطیٰ میں ایک تنگ سی گلی تھی جس کے دونوں طرف واقع عمارتوں میں بیرونی ممالک اور فرانس کے دیگر شہروں سے آنے والے طلبا قیام کرتے تھے۔ کلاسیں باہر گلی میں لگتی تھیں اور اس سڑک کا شمار یوروپ کی مشہور ترین سڑکوں میں ہوتا تھا، دانتے بھی یہاں طالب علم تھا۔ اس گلی کی بڑی قباحت یہ تھی کہ پوپ کا سانڈ یہاں بے مہار پھرتا تھا اور اس کے بول و براز سے گلی غلیظ اور نم رہتی تھی۔ طالب علم اس نمی اور نجاست سے بچاؤ کے لیے پیال بچھا کر یہاں بیٹھتے تھے۔

بارش میں بھیگتی اور پیرس کی ہوا کے تھپیڑے سہتی وہ روبونا پارٹ کی یاترا کو چل دیں۔ روبونا پارٹ سیاحوں اور اہلِ پیرس دونوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ دکانیں جدید اور عتیق آرٹ سے معمور ہیں۔

اب پلاسے دے دوج (Place de Vosgaes) لالی چودھری کی آگے کی زیارت گاہ تھی۔ اس سے قطع نظر پلاسے دے دوج طرزِ تعمیر میں بہت منفرد اور دل کش ہے اور سترہویں صدی کے فرانس کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ سرخ اینٹوں اور ہلکے پیلے رنگ کے پتھروں سے بنی غلام گردشوں اور راہداریوں کی چھبیس ہم آہنگ عمارتوں پہ مشتمل تھا۔ لہلہاتے درختوں سرسبز گھاس اور پھولوں سے مُزیّن سیر گاہوں اور عظیم الشان فواروں کے درمیان لوئی

سیزدہم کا مجسمہ ہے۔ اسے ہنری چہارم نے ڈیزئن کیا تھا۔ ہنزی چہارم نے از سرنو اس کی تعمیر کروائی اور اس عظیم الشان چوک کا نام پلاس رویال (شاہی مقام رکھا)۔ پلاس رویال سے پہلے پیرس میں کوئی عوامی چوک نہیں تھا۔ اس چوک کے مکمل ہونے پر کھیلوں کے ٹورنامنٹ شاہی جشن اور درباری شادیوں کے تقریبات یہیں پہ منعقد ہوتی تھیں۔ دیگر ممالک سے آنے والے سفیر اپنے ملکوں کی خوش حالی، مال و دولت اور ملبوسات کی نمائش کے لیے یہاں عظیم الشان جلوس نکالتے، جنہیں دیکھنے کے لیے پیرس کے لوگ جوق در جوق یہاں جمع ہوتے کیوں کہ عوام کے لیے غیر ملکی ثقافتوں سے روشناس ہونے کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ امرائے فرانس کا پسندیہ میدان مبارزت بھی یہی تھا۔ لنچ کے بعد وہ کتھیڈرل نوترِدام کی زیارت کے لیے جاتی ہیں۔ یہ کتھیڈرل پیرس کے قلب میں واقع ہے اور Gothic طرزِ تعمیر کا شہ کار ہے۔ صلیب کی شکل کا آٹھ سو سال پرانا یہ کلیسا روحانیت میں Vatican کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ کلیسا کا نام حضرت مریمؑ سے منسوب ہے۔ نوتر دام کے معنیٰ ہیں خاتون حال یعنی ہماری خاتون۔ اس کتھیڈرل کی تعمیر پیرس کے بشپ موریس کی فرمائش پہ ہوئی تھی۔ پوپ الیگزینڈر رسوم نے 1163 میں اپنے دستِ مبارک سے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یوں تو یہ کتھیڈرل ہر زاویۂ نگاہ سے دلکش اور دیدہ زیب ہے، لیکن سامنے کا حصہ بہت خوب صورت ہے اور ستونوں اور دروازوں کے زریعے تین حصوں میں منقسم ہے۔ بایاں دروازہ درِ مریم کہلاتا ہے۔ کشتی نوح پہ لوح تورات کنندہ ہیں، منقسم کرتے ہوئے ستون پر حضرت مریم اور نومولود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ ہے۔ دایاں دروازہ سینٹ عین سے منسوب ہے۔ یہاں حضرت مریم دو فرشتوں کے درمیان کھڑی ہیں اور فرشتوں کے اطراف میں بشپ موریس اور لوئی ہفتم کے مجسمے ہیں۔ وسطی دروازہ درِ محشر کہلاتا ہے۔ اس پہ حضرت عیسیٰ محتسب بنے کرسیٔ عدالت پہ بیٹھے ہیں۔ فرشتے اور ابلیس بھی وہاں موجود ہیں۔ دروازے کے محراب پہ بنی اسرائیل کے اٹھائیس پیغمبروں کے مجسمے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران مشتعل عوام نے انھیں فرانسیسی بادشاہوں کے مجسمے سمجھتے ہوئے ان کے سر کاٹ دیئے تھے۔ اور اب وہ Cluny میوزم میں محفوظ ہیں۔ نوترادم کلیسا 433 فٹ طویل، 160 فٹ عریض اور 117 فٹ بلند ہے۔ اس دریچے کے کچھ حصے 1225 عہد کے ہیں، دریچے پہ بُرج سیارے،

روز و ماہ وسال، موسموں اور نیکی اور بدی کی تصویر کشی ہے۔ وسط میں حضرت مریم اپنے شیر خوار بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گود میں لیے کھڑی ہیں۔

اس کے بعد لالی چودھری کلیسا کاٹرے (Treasor) میوزیم دیکھنے جاتی ہیں۔ اس چھوٹے سے میوزیم میں شاہی ملبوسات، تاج، طلائی ظروف اور قدیم صحیفوں کے علاوہ کانٹوں کا وہ تاج جو مصلوب کرتے وقت حضرت عیسیٰؑ کو پہنایا گیا تھا اور تختۂ ڈار کی میخ اور چوب صلیب کی splinter بھی وہاں محفوظ ہے۔ شاہِ فرانس لوئی نے یہ تینوں چیزیں بہت گراں قیمت پہ خریدی تھیں۔ جب وہ نوتر دام سے باہر نکلتی ہیں تو درختوں کی شاخیں ہوا کے جھونکوں سے خم ہو رہی تھیں اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھیں۔ بس لے کر وہ چودھویں صدی میں تعمیر ہونے والی مارکیٹ (Marche) دیکھنے کے لیے Rue de el pee de bois چلی جاتی ہیں۔ اس مارکیٹ میں مستقل دکانیں ہیں اور اتوار کے روز ہزاروں لوگ یہاں خورد و نوش کی اشیا خریدنے آتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ place de la Bastille کے مقام دیکھنے جاتی ہیں۔ یہاں خوب صورت عمارتوں، ریستورانوں اور نگارخانوں سے آراستہ یہ جدید علاقہ تیرہویں صدی کے قلعہ باستی اے سے منسوب ہے۔ بندرگاہ تک رسائی کے لیے تیرہویں صدی میں شہر کی فصیل میں توسیع کر کے رسّوں کا پُل اور دو مضبوط ٹاور بنائے گئے تھے۔ باستی اے کے معنیٰ غیر ملحق ہیں۔ پلاس دے لا باسیتے کی سب سے خوب صورت عمارت اوپیرا ہے جو چار بلاک پہ محیط ہے۔ سنہری مجسموں اور آہنی شمع دانوں سے مزین الیگزینڈر سوم پُل کو دیکھا۔ یہ پُل فرانس اور روس کے درمیان معاہدہ امن منانے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

جب دوسرے دن کی سیاحت پہ لالی چودھری نکلتی ہیں تو pont Petit (چھوٹا پل) کو دیکھا جس کو دیکھ کر ان کے منھ سے بے ساختہ wow نکلا اس کو سن کر ڈاکٹر کمار نے اس پُل کی اہمیت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ''قرون وسطیٰ میں ہر قسم کے موج میلے یہاں منعقد ہوتے تھے۔ آگ، سیلاب اور بیرونی حملوں سے یہ پُل کئی بار تباہ ہوا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں سنگ وحشت سے اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے بعد sun king لوئی

چہاردہم کا خواب محل کو دیکھنے گئیں۔جس کے اندر بڑے اور چھوٹے اصطبل میں پچیس سو گھوڑے اور دوسو بگھیاں سما سکتی تھی۔اپنی عظیم الشان عمارتوں،خوشنما باغوں،دل نواز تفریح گاہوں،وسیع وعریض سنگی زینوں،دیوپیکر مجسموں اور فضامیں پانی کی ندیاں اُچھالتے فواروں کے باعث یہ محل یوروپ کے انتہائی خوب صورت اور بے نظیر تاریخی مقامات میں شمار ہوتا ہے،اور یونیسکو اسے ''آفاقی ورثہ'' کے شرف سے نواز چکی ہے۔لوئی سیزدہم کی اس چھوٹی سی شکارگاہ کو اپنے دورِ حکومت میں لوئی چہاردہم نے الف لیلائی ورسائی محل بنادیا۔اس کی تعمیر پہ پانچ سوملین طلائی فرینک صرف ہوئے جو فرانس کے سالانہ G. N. P کا نصف تخمیہ تھے۔بیگاری کسانوں کے علاوہ چھتیس ہزار سے زائد مزدوروں اور کاریگروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ورسائی کو عظیم الشان محل بنانے کا قصہ بھی بڑا بادشاہی قصہ ہے۔اس قلعہ کے مقابلے میں ورسائی کی حیثیت ایک کٹیا کی سی تھی۔اس محل کی ہر چیز اس بات کی مظہر ہے کہ لوئی چہاردہم کوئی عام بادشاہ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اس عہد کے یوروپ کا عظیم ترین بادشاہ اور نشاۃ ثانیہ کا شہزادہ تھا۔فنونِ لطیفہ کا دلدادہ،خوب صورت اور جاذب نظر لوئی بہت اچھا رقاص،موسیقار،کھلاڑی،شہ سوار،سپہ سالار اور ہر فن مولا حکمران تھا اراپنے کو Roi Soleit شاہ آفتاب کہلاتا تھا۔ورسائی محل یوروپی ثقافت کے دل کی دھڑکن اور ہر حکمران کا خواب محل تھا۔محل کے نگار خانہ رزم (Gallery of Battles) میں فرانس کی چودہ سو سالہ تاریخ مصوری میں بیان کی گئی ہے اور مشہور سیاسی فرانسیسی لیڈروں کے نیم مجسمے اس کمرے کی زینت ہیں۔لوئی شانزدہم اور ماری این ٹونیٹ کی شادی بھی یہی ہوئی تھی۔ژاک لوئی داوید کی نپولین کی رسم تاج پوشی کی تصویر یہاں آویزاں ہونے کی وجہ سے اس کمرے کا نام دیوان تاج پوشی پڑ گیا۔اس محل کا سب حسین اور دل آویز مقام دیوان شیش ہے جو ملکہ اور بادشاہ کی رہائش گاہوں کے درمیان راہداری کا کام دیتا تھا۔اس کا طول دوسو پچاس فٹ،عرض تینتیس فٹ اور بلندی چالیس فٹ ہے۔جھلملاتے ہوئے سترہ وسیع وعریض محرابی آئینے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ہر محرابی آئینہ اٹھارہ قطعوں پہ مشتمل ہے اور آئینوں کے درمیان وسیع وعریض فرانسیسی دریچے نفاست،لطافت اور نزاکت کا شہ کار ہیں۔ورسائی محل کے باغات بھی محل کی طرح انتہائی خوب صورت ہیں۔کہتے ہیں یہاں کبھی

پندرہ سوفوارے ہوا کرتے تھے۔ تین سوفوارے ہنوز باقی ہیں۔ ورسائی محل کا مرکزی موضوع اپالو ہے۔ سب سے خوب صورت فوارہ لاٹونا فوارہ ہے۔ جس پہ اپالواور اس کی بہن ڈائی اینا کے نشاۃ کی کہانی کنندہ ہے۔ لاٹونا ان بچوں کی بن بیاہی ماں تھی اور قرب و جوار میں بسنے والے کسانوں کے نزدیک یہ انتہائی معیوب فعل تھا۔ ورسائی کے فوارے آرٹ اور تکنیک کا دلکش مجموعہ ہیں۔ نہر کلاں چار سوفٹ چوڑی اور ایک میل لمبی ہے۔ اس کے بعد لوف کی طرف سیاحت کی سلسلہ جاری رکھا۔ لوف اپنے طول وعرض اور ضخامت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا میوزم ہے۔ Etoile سے لوف تک کا علاقہ نفاست، خوب صورتی اور دل آویزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ کشادہ سڑکیں، خوب صورت ریستوران اور عالی شان بوطیقوں سے یوں آراستہ ہیں کہ یہاں دل اور bill دونوں پہ اختیار نہیں رہتا ہے۔ لوئی چہاردہم کے ورسائی محل میں منتقل ہوجانے کے بعد 1725 تک یہ محل بے آباد رہا۔ انقلاب فرانس کے دوران اس پہ قبضہ کر کے اور لوئی شانزدہم کا سارا ساز وسامان اور نوادرات لوٹ کر اس محل کو پبلک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان دنوں پورے یوروپ میں یہ پہلا عوامی میوزیم تھا اور اس میوزیم کا اہم اثاثہ لیونارڈو ڈا اور اونچی کی مونا لیزا تھی۔ اس محل میں داخل ہونے کے یوں تو چار راستے ہیں، لیکن سب سے اہم گزرگاہ اکہتر فٹ اونچا شیشے کا اہرام ہے۔ جنوبی حصہ Danon کہلاتا ہے۔ یہاں قدیم یونانی مجسمے، اطالوی نشاۃ ثانیہ کی مصوری، فرانسیسی جدید کلاسیکل اور رومانوی مصوری کے نادر خزینے ہیں۔ میوزیم کا مشرقی حصہ قرونِ وسطیٰ کے اس قلعے پہ مشتمل ہے جو شاہ فلپ آگسٹس نے پیرس کی فصیل کو مستحکم کرنے کے لیے تیرہویں صدی کے آغاز میں تعمیر کروایا تھا۔ بعدازاں یہ قلعہ چارلس پنجم کی رہائش گاہ بنا اور سترہویں صدی تک بادشاہان فرانس کا شاہی مسکن رہا۔ اور اب یہ دو ہزار ق۔م کے ساڑھے چھ فٹ بلند مقدس آتش فشانی پتھر جمورابی کا مسکن ہے جو 1902 میں مصر کی کھدائی کے دوران برآمد ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ وینس دے مائلو کی زیارت کے لیے جاتی ہیں۔ دوسو قبل مسیح کا تراشیدہ محبت کی دیوی زہرہ کا یہ مجسمہ 1820 میں مائلو جزیرہ کی کھدائی کے دوران دریافت ہوا تھا۔ سنگ مرمر کا ساڑھے چھ فٹ قامت کا یہ مجسمہ یونانی حسن اور Sensuality کا شہ کار ہے۔ اس کے دونوں بازو بریدہ ہیں۔ شہرۂ آفاق مجسمہ ساز مائیکل اینجلو

کے دومجسمے ''خوابیدہ غلام'' اور'' باغی غلام''، تو پرستش کی حد تک دل رہا ہیں۔سنگ مرمر سے تراشا ہوا'' خوابیدہ غلام'' ہے۔مائیکل اینجلو کا کہنا تھا کہ یہ دونوں مجسمے تعمیل کی روحانی اذیت اور تکمیل کی وجدانی کیفیت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ یہ مجسمے جولیئس دوم کی تجہیز،تکفین کی یاد میں بنائے گئے تھے اور فرانسیسی انقلاب کے دوران فرانس کو عنایت کر دیئے گئے۔ بیرون اٹلی دنیا میں لوف واحد میوزیم ہے جسے مائیکل اینجلو کے مجسمے رکھنے کا شرف حاصل ہے۔ایک اور خوب صورت مجسمہ'' بال کامرانی''(Winged Victory) ہے۔سنگ تراشی بہت بہترین انداز میں کی گئی ہے۔مجسمے کا دایاں ہاتھ اور بریدہ انگلی ملحقہ المارى میں محفوظ ہے۔ جو مجسمے کی بازیافت کے ایک سوسال بعد ترکی میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران برآمد ہوئی تھی۔اب وہ اپالو گیلری میں داخل ہوئیں جہاں دیگر قیمتی اشیا کے علاوہ ہیرے جواہرات سے مرصع وہ تاج بھی پڑا ہے لوئی پانزدہم اور لوئی شانزدہم سے ہوتا ہوا شہنشاہ نپولین کے سر کی زینت بنا تھا۔اس کے ہیرے کا وزن ایک سو چالیس کیرٹ ہے۔لوف میں مختلف مصوروں کی تصلیب کی Paintings دیکھ کر دل سوگوار اور آنکھیں اشک بار ہوتی رہیں۔''جوان بھکاری''، ''مے نوشی''، ''خانہ بدوش لڑکی''، ''نجومی''، ''بہشت'' جیسی ممتاز پینٹنگ دیکھتے ہوئے وہ یوجین ڈیلا کرو کی مایہ ناز پینٹگ حریت راہنمائے قوم کے پاس کھڑی ہوگئیں۔لوف کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتی ہوئی ایک اور پینٹنگ Rambrandt کی غسل فرمائی ہوئی بیتھ شیبا ہے جو داؤد کا محبت نامہ ہاتھ میں لیے سر جھکائے کسی کشمکش میں مبتلا ہے۔لوف میوزیم میں ایتھنز کے چار سو چالیس قبل مسیح معبد کی شکستہ دیوار کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھی محفوظ ہے۔جس پہ ایک عورت کو جنسی طور پر ہراساں کرتے ہوئے وحشی انسان کی تصویر کنندہ ہے۔ وہاں سے پھر اورزے میوزیم راوانہ ہوگئیں۔ دریا کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیرس کے قابل دید مقامات کے پوسٹ کارڈ پرانی کتابوں اور سونیئر کے اسٹال تھے اور طالب علم اور اناڑی مصور بیٹھے تصویریں پینٹ کرر ہے تھے۔ایک اور دلچسپ پینٹنگ Le Reve(The Dreamer) میں فوجی سپاہی استراحت فرما رہے ہیں اوران کے سروں میں رقص کرتی ہوئی بندوقیں ہیں۔

مذکورہ بالا پیرس کا سفر نامہ ''خیاباں خیاباں اِرم'' تاریخ، ادب، تہذیب، مذہب، متھ اور حقیقت کا خوب

صورت امتزاج ہے۔عمارتوں کا تاریخی منظر، ان کی ثقافتی اہمیت، تعمیری لاگت، ان سے منسوب قصے، ایک ایک تفصیل فراہم کرتی ہیں۔عمارت دیکھنے کے بعد وہ اپنا شخصی تاثر دلچسپ انداز میں تحریر کرتی ہیں۔لالی چودھری تاریخی قصوں کو اتنا دلچسپ بنا کر پیش کرتی ہیں کہ ماضی سانس لیتا نظر آتا ہے۔ان کے اندر مذہبی تعصب ذرا بھی نہیں ہے۔ وہ خدا کے وسیع تر مفہوم ''رب العالمین'' کی قائل ہیں۔ان کی دلچسپی تاریخ اور قدیم عمارتوں سے ہے۔ نئے شہروں کی رنگینیوں سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

سفر نامہ ''جینوا شہرِ امن یا شہرِ جیب تراشاں''

لالی چودھری کا ''جینوا شہرِ امن یا شہرِ جیب تراشاں'' تیسرا سفر نامہ ہے جو انھوں نے سوئیزر لینڈ کی سیاحت کے دوران قلم بند کیا۔انھوں نے یہ سفر اکتوبر میں کیا جنیوا جو ایک سوئیزر لینڈ کا شہر ہے ان کی فلائٹ وہاں لینڈ ہوتی ہے۔ جب ایئر پورٹ لاؤنج میں آئیں تو انکشاف ہوا کہ جس شہر کو عمر بھر جنیوا پڑھتی آئی تھی وہ دراصل جینیف (Geneve) تھا۔ایئر پورٹ سے بذریعہ ٹرین جنیوا شہر میں داخل ہوئیں۔ پیرس اپنی رعنائی اور دل ربائی کے کارن مؤنث اور بین الاقوامی سفارت اور تجارت کا مرکز جنیوا بھی خالص مذکر شہر ہے اور اس کے در و دیوار سے وجاہت اور خوش حالی ٹپکتی ہے۔اس کے بعد جھیل کی جانب جاتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ ہر دوسری یا تیسری دکان گھڑیوں کی ہے۔ بین الاقوامی تنظیموں کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں ہر سال سینکڑوں کانفرنسیں اور نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔کم و بیش دو سو کانفرنس حال تو وسیع و عریض ہیں کہ دس ہزار لوگ بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ہوٹل سے جھیل کا فاصلہ تو دس بارہ منٹ کا تھا، لیکن میں جنیوا کی شادابی اور تر و تازگی سے محظوظ ہوتی ہوئیں خراماں خراماں بیس منٹ میں وہاں پہنچ جاتی ہیں۔اور دو گھنٹے کے ٹور کا ٹکٹ خرید کر کہسار ژورا (Jura) کے دامن میں واقع وسطی یوروپ کی سب سے بڑی جھیل لے مان (جسے عام طور پر جھیل جنیوا کہتے ہیں) کی ریلنگ پہ جھک کر اس کے نتھرے پانی کو دیکھنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ جھیل کسی بھی لینڈ اسکیپ کا سب دلکش خد و خال ہوتی ہے۔شاید اسی لیے جھیل کو چشم ارض بھی کہتے

ہیں۔لیکن تھوڑی دیر بعد وہان سے اُٹھ کر جنیوا کی تازہ ہوا اور جھیل کی نیلاہٹ سے یگانگت استوار کرنے کے لیے بالائی ڈیک پہ جاتی ہیں۔ وہاں کے مناظر بھی دل فریب تھے۔فوارہ فی سیکنڈ آٹھ سو چھتر گیلن پانی جھیل سے کھینچ کر فضا میں چار سوفٹ کی بلندی پہ اُچھالتا ہے۔اسے بنانے کا خیال ایک faulty واٹر پائپ سے مستعار ہے۔ جب پانی چار سوفٹ اونچا اُچھلتا ہے تو فضا میں قوس وقزح کے موتی بکھر جاتے ہیں۔سیاح Oui اور واؤ کہتے ہوئے دھڑا دھڑ تصویریں لے رہے تھے۔ والیتر، گوگل، دوستووسکی، ہیوگو اور ہیمنگوے نے بھی جنیوا میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔جنیوا کا مشہور سیاسی پناہ گزیں لینن تھا۔نرسل گاہ سے اگلا دلچسپ مقام یوروپی نواب روتھ چائلڈ کا رہائشی قلعہ تھا جو اس کی موت کے بعد جنیوا کی بلدیہ کو ترکے میں ملا تھا۔اس سے ذرا آگے درختوں میں گھرا ہوا ایک اور بنگلا تھا جہاں نپولین کی پہلی بیوی رہائش پذیر رہی تھی۔ یہاں سے اقوام متحدہ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور ریڈ کراس کی عمارات صاف نظر آ رہی تھیں۔ 1830 کی تعمیر شدہ بارتھولونی (Bartholoni) حویلی دور سے بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کہتے ہیں بیس اطالوی معماروں نے اس حویلی کی نوک پلک بڑی محنت شاقہ اور لگن سے سنواری تھی۔ان کا جھیل کا سفر ختم ہونے کو تھا اور وہ جزیرہ روسو کے پاس سے گزر رہی تھیں۔جھیل سے واپسی پر گلستان انگلش کے قریب وہ فلورل کال دیکھنے چلی گئی جو سیاحوں کا بہت پسندیدہ اور جنیوا کا سب سے خطرناک مقام ہے۔گھڑیال کی سوئیاں اب تین فٹ کاٹ دی گئی ہیں کیوں کہ گھڑیال کی پوری اور پرفیکٹ تصویر لینے کی کوشش میں مسلسل پیچھے ہٹتے ہوئے سیاح آتی ہوئی گاڑیوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کو ان کا دل نہیں چاہتا تھا لیکن اگلے روز ان کو مونٹرو (Montreux) اور لوزین (Lausanne) جانا تھا۔سو بادل نخواستہ وہ واپس ہوٹل آ گئیں۔

صبح جلدی جلدی تیار ہو کر اسٹیشن پہنچیں۔ چھ دن کا ریلوے پاس خرید کر کوٹ کی جیب میں ڈالا اور کریڈٹ کارڈ ہینڈ بیگ میں رکھتی ہوئیں پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ ہینڈ بیگ کو دوبارہ دیکھا تو کرنسی، ٹریولز چیک، کریڈٹ کارڈ اور پاسپورٹ سب غائب تھے۔ جیب کترا اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا گیا تھا اور وہ گھر سے ہزاروں میل دور اس اجنبی دیار میں بے شناخت ہو گئیں تھی۔ مضمحل اعصاب لیے لالی چودھری اگلے اسٹیشن پہ اتر گئیں۔ بڑی مشکل سے ایک مسافر

کے توسط سے پتا چلا کہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر اس وقت انگلش سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔انھوں نے اس مسافر سے مترجم بننے کی گزارش کی تو وہ اپنی گھڑی پہ نظر ڈالتا ہوا ''سوری'' کہہ کر چلا گیا۔ان کے پاس انتظار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ دو گھنٹے دوصدی میں گزرے۔قریب ہی ایک پولیس اسٹیشن میں انھوں نے رپورٹ درج کرائی۔ پولیس اسٹیشن میں ان سے کہا گیا کہ آج تک سوئزرلیڈ میں کسی کا پاسپورٹ چوری نہیں ہوا کہتے ہوئے اس نے انھیں بتایا کہ اس چوری کی اطلاع ملک کے تمام پولیس اسٹیشنوں میں کر دی گئی ہے۔ پولیس آفیسر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ واپس جنیوا آ گئیں۔ان کے دل میں خیال آیا کہ اگر دو دن میں پاسپورٹ نہیں ملا تو میلان اور وینس جانا ممکن نہیں رہے گا۔جنیوا کی سیاحت کا میگزین ''لوگوں کی لائے ملاپ'' اٹھا کر جھیل کی طرف چل پڑیں۔آثار قدیمہ کی کھدائی سے جنیوا میں بارہ ہزار ق۔م کی انسانی آبادی کے ثبوت ملتے ہیں۔سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی تعلیمات و نظریات نے جنیوا کی تاریخ کا رخ بدل دیا اور یہ شہر پروٹسٹنٹ مذہب کا روم بن گیا۔گیارہ دسمبر کا دن جنیوا کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس تاریخ کو ''شوربے کا میلہ'' بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔گویا کعبے سے بتکدوں کو نسبت ہے دور کی (گیارہویں شریف کے ختم و نیاز کی مناسبت سے) یہ میلا گیارہ دسمبر 1602 میں اہل جنیوا اور کیتھولک ہاؤس آف Savoy کے مابین ہونے والے جنگ کی یاد میں منعقد ہوتا ہے۔اب اہلِ جنیوا ہر سال گیارہ دسمبر کو سترہویں صدی کے ملبوسات پہن کر عظیم الشان جلوس نکالتے ہیں۔ بڑا پُر رونق میلا لگتا ہے۔گو کہ سوئٹزرلینڈ کی ایک چوتھائی آبادی غیر ملکی ہے۔دیگر سیاحوں کے ساتھ وہ بھی فولاد اور بلور سے بنی ریڈ کراس معارت میں جاتی ہیں۔ریڈ کراس تنظیم 1863 میں جنیوا کے مقامی تاجر ہنری ڈورانٹ کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ڈورانٹ اپنے کاروباری سلسلے میں سفر کرتے ہوئے سول فرینو کے میدا جنگ کے پاس سے گزارتو وہ لاشوں اور زخموں سے چور بے یارو مددگار، سپائیوں سے پٹے ہوئے میدان جنگ کو دیکھ کر لرزا اٹھا۔(سول فرینو کے میدان جنگ میں صرف ایک دن میں چالیس ہزار سپاہی زخمی اور ہلاک ہوئے تھے) ڈورانٹ نے مقامی لوگوں کے تعاون سے ریلیف ٹیم بنائی۔1863 میں پہلی جینوا کانفرنس منعقد کی۔ ایک سال بعد بہت سے دیگر ممالک کی

شمولیت سے انٹرنیشنل کانفرنس کا انعقاد ہوا۔جنیوا سے مونٹروتک دائیں جانب جھیل لے مان اور بائیں جانب سدا بہار درختوں پس منظر میں کہیں آبادی اور کہیں انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی لہراتی بل کھاتی پہاڑیاں تھیں۔جھیل میں واقع تین سوساٹھ فٹ لمبی،ایک سوپینسٹھ فٹ چوڑی اور دوسوتیں فٹ گہری چٹان پہ پتھر پہ پتھر اور اینٹ پہ اینٹ کی چنائی سے تعمیر کردہ یہ حیرت انگیز قلعہ جھیل اور کہساروں کے درمیان تنگ گھاٹی کی پہرداری اور پل عبور کرنے والے تاجروں سے ٹیکس کی وصولی کے لیے گیارہویں صدی میں بنایا گیا تھا۔تیرہویں صدی میں اس کے گرد دوہری تہری دیواریں بنا کر اس میں جیل خانہ،ظلم خانہ،اسلحہ خانہ اور بابی Traps کا اضافہ کرتے ہوئے شاہی رہائش گاہ کے سب لوازمات مہیا کر دیئے گئے۔جھیل کی دل فریبی من مندر میں سمائے عولانو وا قلعہ کے آقاؤں کا تہنیتی کمرہ جو اب میوزیم ہے،دیکھنے جاتی ہیں۔لیکن دید سے محروم رہ جاتی ہیں کیوں کہ مرمت کی وجہ سے بند تھا۔انسانی سائیکی کوژولیدہ کر دینے والی جیل سے نکل کر قلعے کے بل کھاتے تنگ چوبی زینے طے کرتی تھکی ماندی تیسری منزل کی کھلی چھت پہ چلی گئیں۔حدنگاہ تک پھیلی ہوئی جھیل بہت دل نواز گل رہی تھی۔وہ قلعے سے باہر نکل کر پھر پولیس اسٹیشن چلی گئیں لیکن وہاں انگلش بولنے والا کوئی نہیں تھا۔وہ جھیل کے کنارے جا کر کھڑی ہوئی کہ شاید کوئی انگلش جاننے والا راہ گیر مل جائے۔اتنی دیر میں دور سے ایک راہ گیر اپنی جانب آتا نظر آیا تو ان کی آس بندھی کہ شاید وہ ہماری مشکل کشائی کر سکے۔وہ صاحب پنجابی تھے،کسی کانفرنس کے سلسلے میں سنگاپور سے آئے تھے اور مونٹرو سے جنیوا جاتے ہوئے جیب کترے کے ہاتھوں اپنا پاسپورٹ ٹکٹ اور کرنسی وغیرہ سب لٹا بیٹھے تھے۔من موہن سنگھ پندرہ ہزار ڈالرز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن انھیں بھی اپنے پاسپورٹ کی فکر تھی۔من موہن جی نے ''پچھلے دودن جنیوا کی سیر کی،آج قلعہ Chillon دیکھ لیا ہے''۔صبح ناشتے کے حسب معمول پولیس اسٹیشن سے رجوع کیا تو پولیس آفیسر کہنے لگا،''اب پاسپورٹ ملنے کی اُمید نہیں رہی،عام طور پر ایک دودن میں مل جاتا ہے۔انھیں پاسپورٹ نہ ملنے کا بہت افسوس تھا۔سوئٹزرلینڈ کے سب سے بلند کوہستانی علاقے کے دامن میں دوجھیلوں کے درمیان واقع ہے۔اس کوہستانی سلسلے کی تین نمایاں چوٹیاں ژونگ فراؤ (Jung frau)(الھڑ دوشیزہ) مونک (Monch)(راہب) اور اوگر

اور بدطینت جن 4107 (بدطینت جن)(Eiger) ہیں۔ الہڑ دوشیزہ کی قامت 4158 میٹر ہے، راہب کا قد 4107 اور بدطینت جن 3970 میٹر بلند ہے۔ ژونگ فراؤ کوہستانی علاقے کو سقف یوروپ بھی کہتے ہیں۔ عمودی چٹانوں کے برف پوش کہساروں، وسیع وعروض گلیشیئر ز اور بلند ترین آبشاروں کا مسکن ہوئے ہوئے یوروپ کا انتہائی خوب صورت اور قابلِ دید مقام ہے۔ پہاڑی چٹانوں کو تراش کر بنائی ہوئی ژونگ فراؤ جانے والی ریلوے لائن یوروپ کی بلند ترین ریلوے لائن ہے اور اس کی تعمیر عصر حاضر کا بہت بڑا عجوبہ ہے۔ تین سو ماہر کاریگر سولہ سال تک اس کی تشکیل میں مصروف رہے تھے۔ ریلوے لائن 3458 میٹر پہ پہنچ کر رک گئی کیوں کہ اس کی تعمیر پہ اتنی کثیر رقم خرچ ہو چکی تھی کہ مزید بجٹ کی منظوری کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سو باقی ماندہ سات سو میٹر کی بلندی کوہ پیماؤں پہ چھوڑ دی گئی۔ فضا کے ہر قسم کی آلودگی سے مبرّا ہونے کی بنا پر یورپ کا بلند ترین محکمۂ موسمیات Sphinex اور فضائی کرنوں کی Radiation کی تحقیقی لیبارٹری یہاں واقع ہے۔ بعد میں لالی چودھری نے من موہن سے کہا، ''پولیس اسٹیشن فون کر کے پاسپورٹ کا پوچھتے ہیں''۔ وہ ہنستے ہوئے کہتے ہیں کہ ''آپ اپنی دعاؤں کا اثر دیکھنا چاہتی ہیں، ویسے میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ دُعائیں مانگنے سے کچھ نہیں ہوتا''۔ اتنے میں فون رِنگ ہوا۔ پولیس اسٹیشن سے کال تھی، لالی چودھری کا پاسپورٹ مل گیا ہے۔ جس شخص کو ملا تھا، پولیس نے انھیں اس کا نام اور فون نمبر نوٹ کروا دیا۔ پاسپورٹ ملنے والے کا نام نکلوس تھا۔ لالی چودھری نے من موہن سے کہا کہ ''Swiss لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ یہاں کسی نے اپنا پاسپورٹ نہیں کھویا''۔ ان کا واپسی کا راستہ مختلف تھا۔ انھوں نے کوہستانی سلسلے پہاڑی اور ساحلی علاقوں سے گزر رہے تھے۔ ٹرین جب fribourg پہنچی تو دریا کے کنارے سے لے کر سرسبز وشاداب درختوں سے گھری پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے اس سدا بہار شہر کو دیکھتے ہوئے ''افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند'' ذہن میں مچلتا رہا۔

انھیں قصے کہانیوں میں ٹرین سوئٹزرلینڈ کے دارالخلافہ برن پہنچ جاتی ہے۔ جس کے بارے میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ وینس (اٹلی) آب پہ تعمیر ہوا ہے اور برن مے پر۔ حدِ نگاہ تک لہراتی بل کھاتی پہاڑیاں انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پہلی برف باری کے بعد یہاں سے جو انگور چنے جاتے ہیں، ان سے کشید کی گئی شراب کو

برفانی مے آئس وائن کہتے ہیں۔ پاسپورٹ ملنے کی خبر نے لالی چودھری کو بہت شاداں وفرحاں کر دیا تھا۔کھانا ذائقے میں واجبی مقدار میں کم اور قیمت میں کافی گراں تھا۔ ویسے بھی جنیوا یورپ کا مہنگا ترین شہر ہے۔کھانے کے دوران موہن جی نے لالی چودھری کے ساتھ نکولس کے شہر جانے کی پیش کش کی تو انھوں نے شکریہ کے ساتھ فوراً قبول کر لی۔ وہ شہرِ جنیوا سے تقریباً پچھتر کلومیٹر دور تھا۔ ساڑھے بارہ بجے وہ لوگ نکولس کے شہر پہنچ گئے۔جس جگہ یہ لوگ پہنچے وہ ری سائیکلنگ فیکٹری تھی۔نکولس کو راستے میں فون کر دیا تھا۔ وہ فیکٹری سے باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے لالی چودھری کا پاسپورٹ دیا۔ پاسپورٹ لے کر اسی کیب سے وہ واپس ریلوے اسٹیشن آ گئے۔جنیوا پہنچ کر وہ شہر کے بس ٹور پہ چلی گئیں۔ دینا بھر کے سفارت خانے، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، نباتاتی گلشن، ولسن محل سے ہوتی ہوئی Baths of Paquis پاکیزہ حمام آ گئیں۔ یہ حمام انیسویں صدی کے آخر میں کام پہ جانے والے مردوں کے مفت غسل کے لیے بنائے گئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد دن کے چند گھنٹے عورتوں کے لیے بھی مخصوص کر دیئے گئے تھے۔اب اس میں ٹرکش حمام اور مساج پاؤلر بھی ہے۔ڈنر کے بعد انھوں نے ہوٹل میں آ کر پیکنگ کی اور اگلی صبح جنیوا کی تلخ و شیریں یادیں لیے وہ واپس لاس اینجلس آ گئیں۔

لالی چودھری کے اس پورے سفرنامے میں پرس کی گمشدگی کے سسپنس کا لطف نظر آتا ہے۔ اور ان کا دعاؤں پر جو پختہ ایقان ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرس کی چوری جیسے سنگین حالات میں بھی انھوں نے ریڈ کراس تنظیم کی تاریخ، قلعہ شی یون کی اہمیت، عمودی چٹانوں کے برف پوش کہساروں، وسیع وعریض گلیشیر اور بلند آبشاروں کی خوب صورت منظر کشی کی ہے۔

سفرنامہ ''کاخ وکوئے طلیطلہ'' (Toledo)

لالی چودھری کا '' کاخ وکوئے طلیطلہ (Toledo) چوتھا سفرنامہ ہے۔ جو انھوں نے اُندلس کی سیاحت میں تحریر کیا ہے۔ لالی چودھری کے اندلس کی سیاحت کے عزم کا سبب یوں ہے کہ گزشتہ دو سال سے اُندلس کی کشش

دامن دل کو بڑی دل ربائی سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔اوروہ کاخ وکوئے طلیطلہ،مسجد قرطبہ،مدینۃ الزہرا،اشبیلہ اور غرناطہ کے سفر کا پروگرام بنارہی تھیں کہ بیجنگ کے اولمپک اسٹیڈیم آشیانۂ طائر(Birds nest) کی دھوم مچ گئی اور وہ یہ سوچتے ہوئے کہ قدیم دیوارچین کے ساتھ بیجنگ کا یہ دواں نکور عجوب کھیلیں شروع ہونے سے پہلے دیکھ آئیں، بیجنگ اور شنگھائی کے سفر پر روانہ ہوجاتی ہیں اوروہ اسپین کی سیاحت التوا میں پڑگئیں۔اس بارہمیں تشکر خدا کی تین چھٹیاں تھیں۔سوانھوں نے اسپین کے لیے رخت سفر باندھا اور لبیک لبیک اے رومانوی اندلس لبیک پکارتی افتاں خیزاں تو ہین KLM طیارے میں پرواز کرتی میڈرڈ پہنچتی ہیں۔ایئرپورٹ پہ ان کی بھانجی فریحہ اوراس کا شوہر ظفراپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کے ساتھ ان کا انتظار پہلے سے ہی کررہے تھے۔

بیالیس میل کی مسافت طے کرتے ہوئے وہ کٹی پھٹی ساحلی چٹانوں پہ واقع تولیدو کی حدود میں داخل ہوگئے۔کوئی اس قدیم شہر کو یونانیوں سے منسوب کرتا ہے اورکوئی رومیوں سے۔ویسے تولیدو عبرانی لفظ تولیدوس سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی ہیں ولادت اورنسلیں۔اسے بنانے اورآباد کرنے میں بارہ یہودی قبیلوں کی کاوشیں شامل ہیں۔رومۃ الکبریٰ دور میں تین اطراف سے دریا میں گھرے اس چھوٹے سے قلعہ بند شہر کا نام طلیطم تھا اور 1935ق۔م میں رومی جرنیل مارکوس نے فتح کیا تھا۔آٹھویں صدی کے آغاز میں اسپین کے حالات بد سے بدتر ہو گئے اور دیگر یوروپ کی طرح اسپین کی سرزمین بھی یہودیوں پہ تنگ ہونے لگی تو وزگاتھ حکومت کی نااہلی سے نالاں اورظلم سے ہراساں یہودیوں نے مغربی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر سے مدد طلب کی (یا اسے خود اسپین کے روبہ تنزل حالات کا پتا چلا) موقع غنیمت سمجھتے ہوئے 711 کے موسم بہار میں موسیٰ بن نصیر نے اپنے جری بہادر نوجوان جرنیل طارق بن زیاد کو بارہ ہزار مسلم فوج کے ساتھ اسپین کی طرف روانہ کیا۔جبل موسیٰ بن نصیر سے نو میل کا بحری راستہ عبور کرتے ہوئے جس پہاڑی کے دامن میں ان کی کشتیاں لنگر انداز ہوئیں اس کا نام جبل الطارق پڑ گیا جو فرنگیوں کی زبان پر بگڑتے بگڑتے جبرالٹر بن گیا۔یہاں خدا کو کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا اورتینوں الہامی مذاہب کے پیروکار بڑی ہم آہنگی اور باہمی میل جول سے رہتے تھے۔ان عرب فاتحین نے تولیدو پہ پونے چارسو سال

حکومت کی اور اسپین کو ہمیشہ کے لیے بدل کے رکھ دیا۔ مغربی مورخ اسپین کے ان عرب فاتحین کو مورز (Moors) کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ وہ مدینہ اور دمشق کے عرب تھے جو شمالی افریقہ کی نومسلم بربری فوج کی قیادت کرتے ہوئے اسپین پہنچے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کوئی عورت نہیں لائے تھے۔ بیشتر مسلم سپاہیوں نے یہاں کی ہسپانوی اور وزِگاتھ خاندان کی عیسائی عورتوں اور (Galieian) سفید فام لونڈیوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو مخلوط نسل پیدا ہوئی، اس نے آٹھ سو سال یہاں حکومت کی۔ لالی چودھری اپنی کار میں بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں تاریخ اُندلس کی ورق گردانی کر رہی تھیں کہ کاریں پل کے پاس رک گئیں اور سارے لوگ کاروں سے اُتر کر باہر کے دل نواز منظر سے چشم ماروشن دل ما شاد کرنے لگے۔ دریا کا شفاف پانی اپنے دامن میں نومبر کے سورج کا سنہرا پن سمیٹے بڑی سبک خرامی سے بہہ رہا تھا۔ سامنے پہاڑی پہ جھاڑیاں ہوا کے جھونکوں سے یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے خالقِ کائنات کے آگے سر بہ سجود ہو رہی ہوں اور دریا پار تولید وشہر کا طرۂ امتیاز القصر اور کتھیڈرل جلال و جمال کا مرقع لگ رہے تھے۔ یہ قدیم پل Alcantra تھا اور وہ ہزاروں سالوں کے روندے ہوئے راستے پہ کھڑیں ان سپہ سالاروں کے نقوش پا ڈھونڈ رہی تھیں جن کے قصوں سے ہم آج بھی اپنی کہانیوں میں رنگ بھرتے ہیں۔

تصویریں لیتے ہوئے ان کی نظر پہاڑ کی بلند چوٹی پہ اٹکے پُر شکوہ مورش قلعے پہ پڑی۔ وقت کی دھول اُسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی نیلے چمکیلے آسمان سے نازل ہوا ہو۔ اس قلعہ کے برجوں سے دشمن کی نقل وحرکت پہ نظر رکھی جاتی تھی۔ رات کو جلتی آگ اور دن کو سلگتے دھوئیں کے ذریعہ اہل شہر اور اردگرد کے علاقوں کو حملے کے خطروں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اب وہ پہاڑ پہ جا کر قریب سے اس فلک بوس قلعہ کو دیکھنا چاہتی تھیں لیکن پتا چلا کہ یہ قلعہ اب اسپین کی ممتاز فوجی اکیڈمی تھا۔

ذاتی بغض وعناد، خاندانی تنازعات، عرب اور نومسلم قبیلوں کی چپقلشیں اور فوجی جوڑ توڑ سے اسپین کی سوا تین سو سالہ عظیم الشان سلطنت 1031 میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یہ چھوٹی چھوٹی خودمختار حکومتیں کاسٹیلے اور لی اون

کے بادشاہوں کی پشت پناہی میں انھیں بھاری خراج ادا کرتے ہوئے برائے نام حکومت کرتی رہیں۔ جب اسپین کے دیگر بادشاہوں نے الفانسو ششم کو شہنشاہ اسپین تسلیم کرلیا تو اس نے حلیف سے حریف بنتے ہوئے تولیدو کو فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور طویل محاصرہ کے بعد مئی 1085 میں تولید و فتح کرتے ہوئے جس دروازے سے شہر میں داخل ہوا وہ ''پرانا دروازہ'' کے نام سے ابھی تک سلامت ہے۔تولیدو کی فتح اسپین کی عیسائی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ تھا، کیوں کہ تولیدو اسپین کے اہم ترین تاریخی و ثقافتی اور فوجی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔

اب ہم تولیدو میں تھے جسے کئی صدیوں تک اسپین کا دارالخلافہ ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔1560 میں فلیپ دوم نے اپنا دارالحکومت نے میڈرڈ منتقل کیا تو اس شہر کی اہمیت کم ہوگئی۔لیکن بھلا ہوا اُنیسویں صدی کے رومان پرست سیاحوں کا جنھوں نے اسے از سر نو دریافت کرکے ''عارفانہ مقام'' کے نام سے نوازا۔

لیکن فلیپ دوم نے نہ صرف عربی زبان اور رسم و رواج کو خلاف قانون قرار دیا بلکہ یہ فرمان بھی جاری کیا کہ مسلم اور یہودی عیسائیت قبول کریں یا اسپین سے نکل جائیں۔مسلم اور یہودی کمیونٹی کے لاکھوں افراد قتل اور جلا وطن ہوئے۔اونچی نیچی بل کھاتی تنگ سڑکوں سے گزر کر کاریں پارک کرتے ہوئے پھر لالی چودھری اور ان کے ہمنوا تولیدو کے بلند ترین مقام پہ واقع القصر دیکھنے چل پڑے۔ ہانپتے کانپتے کشش ثقل سے نبرد آزمائی کرتے اوپر پہنچے تو ہوا اپنی زور آزمائی پہ اتر آئی۔تانک جھانک کی معلومات کا بروشر دیکھا تو اس پہ یہ واجبی سی معلومات تھیں کہ تیسری صدی عیسوی میں رومن محل تھا۔ وزگاتھ کے بعد عرب فاتحین کے قبضے میں آیا تو قلعہ بناتے ہوئے انھوں نے اس میں کافی توسیع کی۔الفانسو ششم اور الفانسو دہم کے دور میں اس کی مرمت کی گئی تھی۔

اسپین کی خانہ جنگی میں القصر بہت بری طرح متاثر ہوا تھا۔خانہ جنگی کے بعد اسے دوبارہ بنایا گیا۔اور یہاں فوجی میوزیم اور لا مانچا ریجنل لائبریری قائم کیے گئے۔انھیں القصر سے زیادہ کیتھڈرل دیکھنے کا شوق تھا۔القصر سے نکل کر فریحہ اور افشاں بچوں کو میکڈونلڈ لے گئیں اور وہ سب سڑک پار کر کے کیتھڈرل چلے گئے۔ یہ کیتھڈرل جو باہر سے فلسطینی زائر کی دھوپ میں پکی ہوئی جلد کی طرح Tan ہے، صرف اسپین کے انتہائی خوب صورت کلیساؤں میں

شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ اسپین کا متمول ترین کلیسا ہے۔ 302 میں شہنشاہ روم نے عیسائیوں کا قتل عام شروع کرتے ہوئے ان کی عبادت گاہیں مسمار کرنے کا حکم جاری کیا تو یہ کیتھڈرل بھی تباہ ہو گیا۔ 305 میں اس کے جانشین کون اسٹنٹین نے عیسائیت قبول کی تو اس نے یہ فرمان جاری کیا کہ اس کے پیش رو حکمران کے مسمار کیے ہوئے گرجے شاہی خرچ پر عظیم الشان طریقے سے دوبارہ تعمیر کیے جائیں۔ لہٰذا بشپ می لان ٹی عز نے از سر نو اس کی تعمیر کی۔ عرب فاتحین کے تولیدو پہ قبضہ کرنے کے بعد یہ گرجا مسجد میں تبدیل ہو گیا اور الفانسو ششم کے تولیدو فتح کرنے پہ دوبارہ گرجا بن گیا۔ 1226 میں اس کی تعمیر از سر نو شروع ہوئی اور ڈھائی سو سال سے زائد عرصے میں مکمل ہوا۔ اس کے رنگ برنگے بلوریں دریچے محراب در محراب طویل و عریض ستون، اس کا خوب صورت عشائے ربانی جس کی آہنی جالیوں پہ خالص سونا جڑا ہوا ہے، انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک پتھر پہ ابھی تک حضرت مریمؑ کے مقدس پاؤں کا نشان ہے، جس پہ یہ الفاظ کنندہ ہیں۔ ''جب جنت کی ملکہ یہاں تشریف لائیں تو پہلا قدم اس پتھر پہ رکھا تھا''۔ دیواروں کے بالائی حصوں پہ قدیم صحیفوں کی تصویر کشی ہے۔

ایک دیوار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب اور دوبارہ زندہ ہونے کی منظر نگاری ہے۔ ایک پر یوم جزا وسزا کا نقشہ کھینچا ہوا ہے اور دوزخ میں دھکیلے جانے والوں کے سات گناہِ کبیرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جہاں تک مصوری کا تعلق ہے یہ کیتھڈرل پرادو کوچک (Little Prado) (میڈرڈ کا عظیم الشان میوزیم) ہے۔ جب اس چکا چوند سے نظریں خیرہ ہونے لگیں تو معبد مریمؑ کی زیارت کرنے کے لیے سب لوگ روانہ ہوئے۔ جو خوب صورت اور آرائش وزیبائش میں بے مثال ہے۔ ایک کمرے میں لعل و گوہر سے مزین حضرت مریمؑ کے ایسے زرق برق ملبوسات ہیں کہ الف لیلیٰ کی شہزادی نے بھی کبھی خواب میں نہیں دیکھے ہوں گے۔ ایک ایک پوشاک کی قیمت کئی کئی ملین ڈالر ہے۔ یہاں لالی چودھری کیتھڈرل کی اندرونی تزئین کاری کی تصویریں لینا چاہتی تھی لیکن وہاں قدم قدم پہ ''یہاں تصویریں لینا منع ہے'' کے سائن لگے ہوئے تھے۔ قریب ہی ٹریول ایجنسی تھی، وہان سے پتا چلا کہ 1000 کی تعمیر شدہ مسجد بالکل نزدیک ہے۔ لالی چودھری اونچی نیچی تنگ گلیوں سے گزرتی مسجد پہنچ گئیں، جس کے

ہر گنبد کا ڈیزائن منفرد ہے۔اورالفانسوششم کے تولید و فتح کرنے کے بعد یہ مسجد کلیسا بن گئی اوراس کا نام کرائسٹ کی مسجد (Del Cristo) پڑ گیا۔زمین اجڑی اجڑی،گلی خالی خالی اور مسجد ویران وسنسان تھی۔نہ مسجد کے گنبد سے کوئی کبوتر اُڑا، نہ کسی منڈیر پہ کوئی کوّا آ کر بیٹھا۔میڈرڈ کی واپسی کے لیے اب سارے لوگ پارکنگ گیراج کی طرف جارہے تھے کہ چندلوگوں کوایک مجسمے کے پاس کھڑے دیکھ کرہم بھی وہاں جاوارد ہوئے۔قریب سے دیکھ کروہ خوشی سے چلااٹھی۔''او مائی گاڈ گیل سروانٹس (Miguel Cervantes)''۔

فریحہ نے حیرت سے پوچھا،''آنٹی یہ کس کا مجسمے ہیں؟''تواس پر لالی چودھری نے فریحہ کو بتایا: کہ

''ڈان قی ہوٹے (Dan Quixote) کے مصنف کا''۔

''دنیائے ادب کا عظیم ترین ناول جسے انجیل کے بعد سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پھر صبح ان کو قصر حضرت سلیمان کے نقشے پہ بنے ہوئے فلپ دوم کے محل کی سیاحت کے لیے El escorial اوردو ہزار سال پرانے طویل وعریض محرابی نالے دیکھنے کے لیے شقوبیہ (Segovia) جانا تھا۔

قصر سلیمان ایس کورئیل محل، ایس کورئیل کی سیاحت کے لیے وہ روانہ ہوئیں۔تیس میل کی مسافت طے کرتے ہوئے وادی الرما میں واقع San Lorenzo de la Escorial شہر پہنچنے تک میڈرڈ کا نیلا چمکیلا آسمان سرمئی بادلوں میں روپوش ہو گیا تھا۔اور گھٹائیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک برسنے کے اشارے کی منتظر کھڑی تھیں۔اس ابر آلود موسم میں سڑک کی بائیں جانب کچھ فاصلے پہ ملگجے سرمئی رنگ کی بڑی وسیع وعریض اور بہت گلومی ڈومی عمارت نظر تو آئی لیکن اسے جیل خانہ سمجھتے ہوئے سارے لوگ آگے نکل گئے۔دوتین چکر کاٹنے کے بعد انکشاف ہوا کہ محل کی Exit لینے کے سلسلے میں جی پی ایس کی راہنمائی بے سود تھی اور جسے ہم جیل خانہ سمجھ رہے تھے، وہی ایس کورئیل محل تھا۔لہٰذا ہم اس بدرنگ، بے کیف اور نیم بن (آدھا جنگل) Colossal سنگی عمارت میں پہنچ گئے جو کبھی شاہی محل ہوا کرتی تھی اوراب کلیسا، میوزیم، درسگاہ، لائبریری اور شاہی قبرستان ہوتے ہوئے اسے اسپین میں نشاۃ ثانیہ کی سب سے بڑی عمارت اور'' آفاقی ورثہ'' ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا۔اس منظر نے باویریا

کی وادیٔ اوبرامرگاؤ(Oberammergau)میں واقع لنڈرہوف محل کی سیاحت کی یاداز سرنو تازہ کر دی تھی۔ ایس کورئیل محل میں آ گئے۔ پہلے یہ جگہ تارک الدنیا راہبوں کی ملکیت تھی۔ ہوا کے تھپیڑ ون سے درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کے انباراور دھاتی میل کے ڈھیر جنھیںEscoria کہتے ہیں، لگے رہنے کی وجہ سےان کا نام ایس کورئیل پڑ گیا تھا۔ بعدازاں سینٹ لورینسو کے اعزاز میں ایس کورئیل سے پہلے اس کے نام کا اضافہ کر دیا گیا۔ انجیل کے بیانات اورنسل درنسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی روایات کے مدنظر قصر سلیمان کے نقشے پہ1563 کے موسم بہار میں اس محل کی سنگ بنیاد رکھی گئی۔ دوران تعمیر وان مر گیا تو اس کی تکمیل کی ذمہ داری اس کے ہونہار شاگرد وان ہریرا کے کندھوں پرآن پڑی اوراسی کے زیرنگرانی یہ محل اکیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ محل تقریباً735 فٹ طویل اور پانچ سوفٹ عریض ہے۔ اس میں بارہ سو دروازے اور ڈھائی ہزار کھڑکیاں ہیں۔ 86 زینے اور 88 فوارے ہیں، اس کی متصف راہداریاں،غلام گردشوں اور گزرگاہوں کی مجموعی طوالت ایک سوبیس میل ہےاوراس میں داخل ہونے کے تین دروازے ہیں۔ وسطی دروازہ شاہی انگنائی میں کھلتا ہے جس کے دونوں سروں پہ حضرت سلیمان علیہ السلام اورحضرت داؤدعلیہ السلام کے عظیم الشان مجسمے ہیں۔ پورے محل میں باپ بیٹے (بہ ظاہر سلیمان، داؤدعلیہا السلام اور درپردہ چارلس پنجم اورفلپ دوم) کی دانائی اور بہادری کے موضوع کی Repitition ہے۔ وسطی دروازے کے اوپرلوہے کی سلاخیں پکڑے ساان لورینسو کا دیو پیکر مجسمہ ہے، لوہے کی سلاخیں سان لوینسو کی شہادت کا نشان امتیاز ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی میں عیسائیت قبول کرنے کی پاداش میں اسے زندہ سلاخوں پہ بھونا گیا تھا۔ چرچ میں مشہورسنگ تراش Cellini کے تشکیل کیے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرمریں مجسمے کو دیکھنے لگیں۔ جسے کاریگراپنے کندھوں پہ اٹھا کرساڑھے پانچ سومیل کی مسافت پیدل طے کرکے بارسیلونا سے یہاں لائے تھے۔ لالی چودھری کی بھانجی کے شوہر نے انھیں عشائے ربانی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ویلاث قث کی مشہور پینٹنگ ''یوسف کا کرتہ'' اورتیسی عانو(Tisiano) کی'' آخری طعام شام'' آویزیں تھیں۔ یہاں سےنکل کروہ لوگ شاہی قبرستان چلے گئے جہاں کارلوس پنجم (چارلس پنجم) سے لے کر موجودہ بادشاہ وان کارلوس کے باپ تک گزشتہ پانچ

صدیوں کے ہسپانوی فرمانرواؤں اوران کی رانیوں کے مرمریں تابوت ہیں۔(لیکن صرف انھیں رانیوں کے جو ولی عہد شہزادیوں کے مائیں تھیں) دیگر رانیوں اور شہزادے شہزادیوں کے لیے علیٰحدہ قبرستان 1888 میں بنایا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح یہاں سے گزرتے ہوئے سارے لوگ فن تعمیر کے میوزیم چلے گئے۔ جہاں محل کے بلو پرنٹ اور اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سب اوزار محفوظ ہیں۔ایس کوریئل محل میں ان کا پسندیدہ مقام ہزاروں انمول کتابوں اور مسودوں پہ مشتمل اس کی وسیع وعریض و بلند لائبریری ہے جو فرش سے چھت تک کتابوں سے معمور ہے۔ کتابوں کی مجموعی تعداد چالیس ہزار ہے اور سلطان ابو معالی کے مجموعات بھی اس لائبریری کی زینت ہیں۔ایوان حرب کی دیواروں پہ اسپین کی مشہور فوجی فتوحات کی تصویر کشی دیکھتے ہوئے عربوں کی ذلت آمیز پسپائی اور فرڈینینڈ کو غرناطہ کی چابیاں دیتے ہوئے بوعبدل (سلطان ابوعبداللہ) کی تصویر نے بہت آزردہ کیا۔اس کے بعد وہاں سے وہ لوگ القصر کے پاس پہنچ گئے۔لہٰذا زمستان کی اس طوفانی رات میں سردی سے کپکپاتے ہوئے وہ القصر کی چھت سے نیچے اُتر کر سقوبیہ کے مشہور ترین قابلِ دید مقام مرابی آبی نالوں کا نظارہ دیکھنے لگے۔دو ہزار سال کہنہ یہ محرابی آبی نالے دس میل دور سے Rio frio (دریائے فری او) کا پانی اہل شہر کے استعمال میں لانے کی غرض سے رومی انجینئروں نے تعمیر کیے تھے۔ان 166 محرابی نالوں کی طوالت نصف میل اور بلندی 30 فٹ سے زائد ہے۔ درمیانی محرابیں دومنزلہ ہیں اوران کی بلندی ساڑھے ترانوے فٹ ہے۔دنیا میں اپنی نوعیت کے یہ واحد محرابی آبی نالے ہیں جو بغیر کسی چونے گارے یا سیمنٹ کے محض پتھروں کی چنائی سے بنائے گئے ہیں۔ یہ نالے تقریباً دو ہزار سال تک کارآمد رہے۔حال ہی میں ان کا استعمال بند ہوا ہے۔اسکوریئل محل اور سقوبیہ کے قدیم شہر کو بھی ''آفاقی ورثہ'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔واپسی پہ وہ ہموار علاقے سے گزرتے ہوئے میڈرڈ پہنچے۔اس شہر کی بنیاد نویں صدی میں عربوں نے رکھی تھی اور محمد اول کے حسب ارشاد یہاں دریا کے قریب ہونے کی بنا پر اس کا عربی نام مریط (سر چشمۂ آب) پڑ گیا، جو گزرتے وقت کے ساتھ مریط سے مجریط اور بالآخر میڈرڈ بن گیا۔لالی چودھری پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پلازا میئر کی طرف آئے اور یہ چوک قرونِ وسطیٰ کے میڈرڈ کا دل ہے اور سترہویں صدی کے

بنے ہوئے ایک سوچھتیس مکانوں میں گھرا ہوا ہے۔ دو صدیوں تک یہ چوک حکومت کے باغیوں اور مخالفین کے سر قلم کرنے اور بل فائٹنگ کا مرکز رہا۔ لہٰذا اب سب نے اپنا رخ شاہی محل کی طرف موڑ لیا جو ورسائی اور شون برون کے بعد یوروپ کا تیسرا بڑا عظیم الشان محل ہے۔ گراں قیمت فانوسوں، پورسلین اور طلائی پانی سے مزین پیتل سے آراستہ و پیراستہ دو ہزار کمروں پہ مشتمل یہ محل فلیپ پنجم نے تعمیر کروایا تھا۔ خراماں خراماں چلتے ہوئے وہ ایوانِ ستون میں پہنچ گئے۔ شہنشاہی دور میں یہ بال روم تھا۔ اب اہم تقریبات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں تو ان کے منھ سے بے اختیار Dios Mio (مائی گاڈ) نکلا۔ یہ کمرہ شاہی محل کا ماحصل ہے، اتنا طویل کہ کھانے کی میز کے گرد ڈیڑھ سو مہمانوں کی کرسیاں ہیں اور چھت پہ آویزاں پندرہ فانوسوں میں ہزاروں برقی قمقمے ہیں۔ چوبی فرش پہ بہت بڑا اگل دان پڑا ہے، جس پہ کرسٹوفر کولمبس کے نئے ریڈ انڈین دوستوں کی تصویر کشی ہے۔

اس خوب صورت کمرے سے نکل کر شاہی محل کو خیر باد کہتے ہوئے گویا ولاث قث، ایل گریکو، رفاعیل اور دنیائے مصوری کے دیگر نامور فن کارون کی مایہ ناز کینوسی تخلیقات سے بھرپور پرادو میوزیم جا پہنچے جس کی تعمیر کولمبس کی دریافت کی ہوئی نئی دنیا کے زرناب سے ہوئی تھی اور اس جہانِ نو کے سیم وزر سے خریدی ہوئی پینڈنگ کا اتنا وسیع ذخیرہ یہاں موجود ہے کہ اس کی نمائش کے لیے پرادو جیسی مزید تین عمارتیں درکار ہیں۔ لہٰذا تین چوتھائی پینٹنگز بند پڑی ہیں۔ اس کی تشکیل اور تزئین اس رنگ ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ میوزیم کے بجائے کسی آرٹ کے دلدادہ ڈیوک کی خوب صورت حویلی لگتی ہے۔

مینار اور القصر اشبیلہ، لالی چودھری کو یوروپ کا سفر دوست ٹرین سسٹم بہت پسند ہے۔ تیز گام برقی ریل گاڑیاں اسمارٹ اور آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کی بہت پابند ہے۔ اگر آوے ٹرین پانچ منٹ سے زیادہ لیٹ ہو جائے تو کرایہ واپس ہو جاتا ہے۔

پام کے سینکڑوں درختوں اور ٹروپیکل پودوں میں گھرے ہوئے کنول کے تالاب میں تیرتے ہوئے کچھوے نگاہوں کو تازگی اور روح کو طمانیت اور آسودگی سے ہم کنار کر رہے تھے۔ یہ وہی ٹرین اسٹیشن ہے جہاں مارچ

2004 میں بموں کے دھماکوں سے 191 افراد ہلاک اور اٹھارہ سو آدمی زخمی ہوئے تھے۔ اسپین میں جب سے آوے ٹرین شروع ہوئی ہے، چار پانچ سو میل کے فاصلے پہ واقع شہروں کے درمیان ہوائی جہاز کے سفر میں چالیس فی صد کمی آئی ہے۔ لوگ آرام دہ برقی ٹرین کو طیارے پہ اس لیے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ نہ تو کوئی سیکورٹی سے گزرتے وقت جوتے اتارنے کی قباحت ہے نہ Padding down کی خجالت۔ نہ فلائٹ سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے چیک ان ہونے کی ھپڑ دھپڑ۔ ٹرین کی روانگی سے پانچ دس منٹ پہلے پہنچ جاؤ، اللہ اللہ خیر صلا۔ ٹرین سانپ کی طرح بل کھاتی کبھی کسی سرنگ سے گزرتی، کبھی کسی پہاڑی پہ ماضی کی دھول میں اٹے پرانے قلعے کے کھنڈر یا کسی فصیل کی شکستہ دیوار اپنی جھلک دکھا کر فوراً نظروں سے غائب ہو جاتے کبھی کسی پہاڑی سلسلہ پہ سرخ ٹائلوں کی چھتوں کے مکان اپنی چھب دکھا کر چھپ جاتے۔ کمپارٹمنٹ کی دیوار پہ گاڑی کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ تھی۔ ٹرین قرطبہ کے اسٹیشن پہ رکی تو قرطبہ کا نام پڑھتے ہی ''دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں'' گیارہویں صدی کا آغاز اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا آخری دور تھا اور ایک عظیم الشان تہذیب نے زوال کے سفر پہ پہلا قدم رکھا تھا۔

1170 میں الموحد حکمران ابو یعقوب یوسف نے اشبیلیہ کو اپنا ہسپانوی دارالخلافہ قرار دے دیا۔ موٹر وے سے اتر کر کیب قدیم تاریخی شہر میں داخل ہوئی تو بل کھاتی تنگ و تاریک گلیوں نے لاہور اندرونِ شہر کی یاد تازہ کر دی۔ انھوں نے دل ہی دل میں خود کو لعن طعن کیا کہ شہر کے اتنے قدیم حصہ میں قیام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اشبیلیہ دنیا کے ان معدودے چند شہروں میں شمار ہوتا ہے جن کی عظمت کا اندازہ ان کی تاریخی اہمیت سے لگایا جاتا ہے۔ نومبر کی سنہری دھوپ میں جگمگاتے ہوئے کلس دیکھ کر میں کیتھڈرل چلی گئی۔ یہ کیتھڈرل الموحہ سلطان ابو یعقوب یوسف کی مسجد کو مسمار کر کے بنایا گیا ہے۔ پندرہویں صدی میں جب نیا کلیسا بنانے کا فیصلہ ہوا تو یہ طے پایا کہ اتنا وسیع و عریض کلیسا بنایا جائے کہ بعد میں آنے والی نسلیں اسے دیکھ کر پکار اٹھیں کہ اس کلیسا کے بنانے والوں کا دماغ چل گیا تھا اور یہ مبالغہ آرائی نہیں کیوں کہ یہ کلیسا دنیا کا سب سے بڑا گاتھک کیتھڈرل ہے اور نئی مکعب پیمائش کے مطابق روم کے سینٹ پیٹرز اور لندن کے سینٹ پاک کو پیچھے چھوڑ گیا ہے اور دنیا میں عیسائیت کا سب سے بڑا کیتھڈرل ہے۔ کرسٹو

فرکولمبس اس کیتھڈرل مین دفن ہے، لیکن اس چرچ کو جو شہرتِ دوام حاصل ہے وہ اس کا جیرالڈا برج ہے جو اشبیلہ کی خوب صورت ترین عمارت ہے۔ اور دراصل سلطان ابو یعقوب یوسف کی مسجد کا مینار ہے۔ جسے 1184 میں سلطان نے تعمیر کروایا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ بیس منزلہ برج دنیا کا بلند ترین برج تھا۔ اصل میں یہ ایک برج نہیں دو و برج ہیں۔ ایک کے اندر دوسرا برج۔ اور ایک برج سے دوسرے برج میں جانے کے لیے زینوں کے بجائے پینتیس Ramps ہیں جو اتنے کشادہ ہیں کہ دو گھوڑا سوار شانہ بہ شانہ ان پر سے گزر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسجد اتنی مقدس اور باعث افتخار تھی کہ اپنی شکست کے آثار دیکھ کر وہ اسے مسمار کرنا چاہتے تھے۔ فرنانڈو نے جب یہ افواہ سنی تو پیغام بھیجا کہ اگر اس کی ایک اینٹ یا پتھر کا ہلایا تو شہر فتح کرنے کے بعد وہ کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ لالی چودھری کا کہنا ہے کہ فرنانڈو سوم کی یہ دھمکی مجھے یزید بن معاویہ کی صدائے بازگشت سنائی دی۔

جب عیسائیوں نے کیتھڈرل جانے کے لیے مسجد مسمار کی تو اس خوب صورت مینار پہ بُرج درا کا اضافہ کر کے اس پہ کانسی کا بادنما لگا دیا، جس کی وجہ سے اس کا نام جیرالڈا پڑ گیا۔ اب اس پہ اطالوی لبادے میں ملبوس عورت کا مجسمہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں کھجور کا پتا ہے اور دوسرے میں ڈھال۔ کیتھڈرل سے نکل کر وہ القصر جاتی ہیں جو رومیوں کے وقت میں قلعہ تھا اور عربوں کے عہد میں القصر بن گیا۔ 930 میں عبدالرحمان سوم نے اس قلعاتی محل کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ درونِ فصیل یہ کئی محلات پہ مشتمل ہے، اس کی روشیں باغیچے اور گلشن بہت دل نواز ہیں۔ طرزِ تعمیر میں مسلم، گاتھک اور نشاۃِ ثانیہ کی آمیزش ہے۔ الموحدین کے دور میں اس کی توسیع ہوئی تھی، دروازہ کے پہلو میں قدیم الموحد دیواریں ابھی تک قائم و دائم ہیں۔ لیکن موجودہ طرز تعمیر عیسائی حکمرانوں کے عہد کی ہے۔ اشبیلہ فتح کرنے کے چار سو سال بعد تک القصر عیسائی بادشاہوں کی پسندیدہ رہائش گاہ رہا۔ موجودہ بادشاہ وان کارلوس جب بھی اشبیہلہ آتا ہے یہاں القصر میں قیام کرتا ہے۔ پیڈرو ظالم کی تو یہ ہر دل عزیز جگہ تھی۔ اس کا محل بالکل اسلامی محل لگتا ہے۔ 1350 میں جب اس نے اپنا یہ محل تعمیر کروایا تو غرناطہ سے کاریگر بلائے گئے تھے۔ اس کے محل کی دیوار پہ لا غالب الا اللہ ''اللہ کے سوا کوئی فاتح نہیں'' کے علاوہ ''اللہ ہمارے سلطان پیڈرو کو اپنے حفظ و امان میں رکھے'' بھی کنندہ ہے۔

پھرایوانِ کارلوس پنجم پہ سرسری نظر ڈالتے ہوئے وہ ماریا پادیا کے خوب صورت کمروں میں آ گئیں۔ ماریا پادیا ظالم پیڈرو کی داشتہ تھی اور یہ محل اس نے ماریا کے ساتھ رہنے کے لیے تعمیر کروایا تھا۔محل کے آخری کمرے کے پیچھے گڑیا گھر ہے، مسلم سلاطین کے زمانے میں یہ حرم سرایا زنان خانہ تھا۔اس کمرے میں پیڈرو نے اپنے بھائی فادرریقے کو قتل کیا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ القصر کے گلشن میں داخل ہوئیں، جہاں قوسی محراب دارچھت کے غسل خانے میں ماریادے پادیا غسل کیا کرتی تھی۔ یہاں محل کو پانی مہیا کرنے کے نل ہیں۔ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے جسے فلپ پنجم نے بنوایا تھا۔شام ہونے لگی تھی، اب وہ القصر سے نکل کر وادیٔ الکبیر کے کنارے بارہ اطرافی قلعہ تورے دل اورو چلی گئیں۔ یہ الموحد دور کی آخری عمارت ہے، اوراسے القصر کو مزید مستحکم کرنے کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ یہ بھاری زنجیروں کے ذریعے دریا کی دوسری طرف کی گزرگاہ سے متصل تھا۔ ویسے بعدازاں یہ قلعہ امریکہ سے لائے ہوئے سونے کو ذخیرہ کرنے کے لیے بطور گودام استعمال کیا گیا۔ یہ قلعہ اب میوزیم ہے۔

حرم قرطبہ، اشبیلہ کے مطالعے سے لالی چودھری کو پتہ چلا کہ نئی دنیا سے لائے ہوئے سونے چاندی کو اور تمباکو کی بدولت سترہویں صدی میں اشبیلہ اسپین کا سب سے بڑا اور متمول ترین شہر تھا۔قرطبہ کی زیارت کا شوق ان کے دل میں وافر تھا اوراس کی زیارت کے لیے وہ پہنچ گئیں۔قرطبہ جوامیہ دورِحکومت میں اندلس کا عروس البلاد تھا۔ یہ مشرق میں استنبول اور بغداد کا ہم پلہ اور مغرب میں لاثانی تھا۔ یوروپ کا ہی نہیں بلکہ دینا کا سب سے بڑا اور گنجان شہر تھا۔اس کی آبادی پانچ لاکھ تھی۔ یہاں پانچ سو مساجد اور تین سو عوامی حمام تھے۔شہر کی سڑکیں اور گلیاں ہموار اور پختہ تھیں۔شہر میں ستر لائبریریاں تھیں۔جن میں کتابوں کی مجموعی تعداد ایک ملین کے لگ بھگ تھی۔عبدالرحمان سوم اوراس کا بیٹا الحکم ثانی خود بہت بڑے عالم وفاضل تھے۔الحکم ثانی کی ذاتی لائبریری میں چار لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔اس سنہری دور میں مسلم، یہودی اور عیسائیت بہت امن وآشتی اور باہمی محبت سے رہتے تھے۔امیہ الاندلس تین ثقافتوں اورتہذیبوں پہ مشتمل ایک سلطنت نہیں بلکہ تین مذاہب کے لوگوں کی ایک مشترکہ ثقافت کی حامل سلطنت تھی۔ یونیورسٹی میں عربی، عبرانی، اور لاطینی آوازیں گونجتی تھیں۔

لائبریریاں، الجبرا، طب، سائنس، قانون، فقہ، ادبیات اور فلسفے کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ الحکم ثانی نے عرب مسلمانوں، یہودیوں اور Mozarab مثل عربی عیسائیوں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی تھی جنھوں نے بہت سی یونانی اور لاطینی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ٹرین پینتالیس منٹ میں قرطبہ پہنچ گئی۔ مسجد قرطبہ ٹرین اسٹیشن سے بہت قریب ہے، کیب سے وہاں پہنچنے میں چند منٹ لگے۔ اب وہ وقت کی دھول میں گدلائی ہوئی مسجد قرطبہ کے سامنے کھڑی تھیں۔ (صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک مسجد میں داخلہ مفت ہے) مسجد کے صدر دروازے پہ دو محافظ کھڑے تھے۔ جو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد مغرب کے مسلمانوں کا مقدس ترین مقام تھا۔ اسپین کے وہ مسلمان جو حج کے لیے نہیں جا سکتے تھے، وہ مسجد قرطبہ میں حاضری دیتے تھے۔ آج بھی یہ مسجد قرطبہ شہر کا نشانِ عظمت ہے۔ 1986 میں اس کی بارہ سو سالہ سالگرہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی تھی۔ قدیم زمانے میں اس کا نام قراطحو بہ تھا اور آٹھویں صدی ق۔م میں یہاں لوگ بستے تھے۔ رومی اور بازنطینی حکومتوں کے زیرِ اقتدار قرطبہ خوب پھلا پھولا تھا۔ عبد الرحمان اول نے اپنی عیسائی رعایا سے گرجا خرید کر اسے مسمار نہیں کیا بلکہ اُدھیڑ کر وہی سنگ و خشت اس مسجد کی تعمیر میں استعمال کیے۔ سنگِ بنیاد رکھنے کے دو سال بعد 786 میں مسجد مکمل ہوئی۔ مسجد کا دروازہ کھلا تو زنجیرِ خیال توڑتے ہوئے دونوں محافظوں کے اشارے پہ زیرِ لب بسم اللہ پڑھتی ہوئی چھ سوفٹ طویل اور ساڑھے چار سوفٹ عریض مسجد میں داخل ہوگئیں۔ صحن میں مالٹوں کے پیڑ، سبز پتوں کے احرام زیب تن کیے عالم استغراق میں کھڑے تھے۔ سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے ان لوگوں نے مسجد کے اندر قدم رکھا، تو نیم تاریکی میں ستونوں کے وسیع و عریض جنگل کے سوا مجھے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ مسجد کی دل نواز سادگی اور کشادگی کو کیتھڈرل کی نیم تاریکی نگل گئی ہے۔ مسجد میں دو سو اسی فانوس اور 1445 شمع دان تھے۔ اس میں داخلے کے 19 دروازے تھے جو نمازیوں کی آمد و رفت کے علاوہ تازہ ہوا اور روشنی کا بھی ذریعہ تھے۔ اب صرف ایک دروازہ استعمال ہے۔ باقی اٹھارہ دروازے مقفل کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ایک ایک ستون کو چھوتی ہوئی ساتھ جہتی گنبدیں محراب کی طرف بڑھی جہاں امام مسجد نماز کی اقامت کرواتا تھا اور بیس ہزار نمازی کندھے سے کندھا ملائے اس کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔ عبدالرحمان دوم، سوم اور الحکم دوم نے مسجد کو وسیع کروایا تھا۔

عبدالرحمان سوم نے جو مینار تعمیر کروایا تھا، وہ اب کیتھڈرل کا حصہ ہے۔ اس پہ برج درا کا اضافہ کر کے قرطبہ کے محافظ فرشتے رفائیل کا مجسمہ نصب ہے۔ الحکم دوم کے عہد زریں میں مسجد قرطبہ کی ایسی عظیم الشان توسیع ہوئی کہ حوالہ جات کے لیے یہ مسجد دمشق کا نعم البدل بن گئی۔ گنبد کی چھت سنگ مرمر کی واحد سل سے صدف کی شکل میں تراشی ہوئی ہے اور اس کے رنگ برنگے کانچ کے سقفی روشن دان بازنطینی صناعی کا شہ کار ہیں۔ محراب کی دیواروں پہ لکھی ہوئی قرآنی آیات اور بازنطینی طرز کی سنہری زنگی، سرخ فیروزی اور سبز پچی کاری کی خوب صورتی بیان کرنے کے لیے خامہ صحیح معنوں میں انگشت بدنداں ہے۔

لالی چودھری نے اپنے کیب ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے مدینۃ الزہرا اور ابن رشد کا مجسمہ دکھاتے ہوئے قرطبہ ٹرین اسٹیشن چھوڑ آئے۔ وہ پہلے مجھے قرطبہ سے پانچ میل کے فاصلے پر مدینۃ الزہرا لے گیا۔ عبدالرحمان سوم نے یہ محل اپنی چہیتی بیوی جس کا اسلامی نام زہرا تھا، کی دل جوئی کے لیے بنایا تھا۔ مدینۃ الزہرا اپنے وقت کا ورسائی بلکہ اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور عظیم الشان محل تھا۔ پچیس سال تک دس ہزار کاریگر اس کی تعمیر میں مصروف رہے اور شاہی بجٹ کا ایک تہائی حصہ اس کی تعمیر پہ صرف ہوتا رہا۔ بازنطینی عیسائی شہنشاہ نے اس محل کے لیے سنگ مرمر کے ایک سو چالیس ستون بھیجے تھے۔ ایوانِ خلیفہ کا فرش کئی رنگ کے خوب صورت پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ آب نوسی اور ہاتھی دانت کے دروازے دل نواز باغیچوں اور گلستان میں کھلتے۔ محل میں اتنا وسیع وعریض تالاب تھا کہ اس میں تیرتی ہوئی رنگ برنگی مچھلیوں کی خوراک کے لیے روزانہ بارہ ہزار ڈبل روٹیاں درکار تھیں۔ سو اس کے شایان شان محل کی سنگ بنیاد 936 میں رکھی گئی۔ 947 میں مسجد تعمیر ہوتے ہی اس نے اپنا دربار قرطبہ سے مدینۃ الزہرا منتقل کر لیا۔ یہ محلاتی شہر Status کے حساب سے تعمیر کیا گیا تھا۔ عبدالرحمان سوم کا محل پہاڑ کی چوٹی پہ تھا تاکہ رعایا اور غیر ممالک سے آنے والے سیاحون اور غیر ملکی عمائدین مملکت کو دور سے نظر آئے۔ شہر کے گرد دوہری فصیل تھی اور ہر فصیل کی دیوار پندرہ فٹ دبیز تھی۔ محل اور مسجد کے علاوہ اس میں چار سو مکان، مارکیٹ، باغات اور حوض تھے اور اس کی آبادی دو ہزار تھی۔ لالی چودھری کی نظر میں ایوان خلیفہ کے مرمریں ستونوں اور فرش کے علاوہ انھیں کوئی خاطر خواہ عمارت نظر نہیں آئی۔ واپسی پر کیب ڈرائیور نے انھیں ابن رشد کے مجسمے کے پاس چھوڑ دیا۔

قرطبہ کوالوداع کہتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں کہ کتنی خونچکاں داستانیں اس شہر سے وابستہ تھیں۔کبھی اسلام غالب آیا،کبھی اسلام مغلوب ہوا۔کبھی ابن رُشد کی جلی ادھ جلی کتابوں کے ڈھیر پر قرطبہ کی مسلم آبادی نے خوشی کے نعرے لگائے،کبھی لائبریریوں کی لاکھوں کتابوں کے الاؤ پر عیسائی حکومت نے رقص کیا۔

شام غرناطہ، لالی چودھری کا سفر غرناطہ کی طلسمی بزم کی طرف تھا۔غرناطہ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے، اپنی عظیم الشان تاریخی، ثقافتی اور آفاقی حیثیت (یونیسکو اسے آفاقی ورثہ کے خطاب سے نواز چکی ہے) کے علاوہ اپنی معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بھی بہت مقبول ہے۔ دائمی برف پوش Siera Nevada کے دامن میں سطح سمندر سے 650 سے 850 میٹر کے ارتفاع پہ واقع ہونے کی وجہ سے سورج کی روشنی سے تاباں شفاف نیلا آسمان غرناطہ کا انمول اثاثہ ہے۔تاریخ نے غرناطہ پہ اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں، از منہ قدیم سے ہی اس کا تعلق تہذیب یافتہ قوموں سے رہا ہے۔رومیوں کی یہاں آمد تاریخ کا ایک بہت اہم واقع ہے۔آٹھویں صدی کے آغاز میں یہودی باشندوں کے ایما پر جب مورز یہاں داخل ہوئے تو اس شہر کا نام غرناطہ الیہود تھا (غرناطہ ہسپانوی زبان میں انار کو کہتے ہیں) مورز نے ''الیہود'' کا لفظ حذف کرتے ہوئے اناروں کے باغات کی وجہ سے اس کا نام غرناطہ رہنے دیا۔

محمد پنجم کے عہد میں غرناطہ کی عظمت اپنے عروج پہ پہنچی تھی۔اس کے وزیروں، مشیروں میں مشہور شاعر اور مورخ ابن خطیب طاہر نامور ماہر ابن ختیمہ اور ممتاز شاعر ابن سمرق جیسے ذہین وفطین لوگ شامل تھے۔کیب ڈرائیور سے لالی چودھری نے کہا کہ مجھے پہلے نامور ادیب وشاعر اور مفکر لورکا کے گھر کی زیارت کے لیے لے چلو اور بعد میں یہیں واپس چھوڑ دینا۔لورکا کا میوزیم غرناطہ سے سترہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ابتدائی تعلیم اس نے اپنے آبائی وطن ہی میں حاصل کی تھی۔پھر فلسفہ اور ادبیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے غرناطہ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔اسے الحمرا سے بہت لگاؤ تھا۔

لنچ کے بعد وہ ازابل کیتھولکا پلازا جاتی ہیں۔ جہاں انڈیا کا نیا بحری راستہ دریافت کرنے کا منصوبہ دکھاتے ہوئے

کرسٹوفرکولمبس اور ملکہ ازابیلا کا بہت بڑا مجسمہ ہے۔شاہی معبد سے منسلک ایک ساگریروکلیسا غرناطہ جامع مسجد پہ بنایا گیا تھا۔ پہلے یہ مسجد کلیسا کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔اٹھارہویں صدی میں مسجد کومسمار کرکے وہاں کلیسا استوار کیا گیا۔ وہاں سے لالی چودھری Zacatin کی جانب چل دیں۔ جوالقیصر یہ کے پہلو میں ہے اورانیسویں صدی تک غرناطہ کا بہت اہم مقام تھا۔ یہاں حماموں،ایکس چینج اور عدالت کے علاوہ ضروریات زندگی کی تمام اشیاء کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔تولیدو کی طرح غرناطہ بھی اسلامی ثقافت اورعلم وادب کا اہم مرکز تھا۔ مدرسے کا شمارغرناطہ کی خوب صورت ترین عمارتوں میں ہوتا ہے۔اسلامی عہد میں البائی سین نہایت اہم شہر تھا۔اسلامی عہد میں البائی سین غرناطہ کا سب سے گنجان آباد شہر تھا۔ یہاں کی آبادی ساٹھ ہزارتھی واراس میں چھبیس مساجد تھیں۔

طلسم الحمرا، سامنے رات میں پہاڑی پہ الحمرا چاندنی رات کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔ بروشرز اور نقشے لے کر رومینٹک الحمرا کی جانب چل دیئے۔وہ الحمرا جس سے سینکڑووں رزمیہ بزمیہ گیت، نغمےاور قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔یہ غرناطہ کے مسلم سلاطین کا محل تھا، وہ اسے جنت الارض کہتے تھے۔موزر کے عہد میں یہ قلعہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں چالیس ہزارافراد کے رہنے کی گنجائش تھی۔گیارہویں صدی میں جب Ziri سلطنت کے حکمرانوں نے البائی سین پہاڑی کواپنی رہائش گاہ بناتے ہوئے اس کے گرد فصیل بنائی تو الحمرا غرناطہ کا اہم ترین قلعہ بن گیا۔ تیرہویں صدی میں ناصری سلطنت کے بانی محمد اول الغالب ابن الاحمر نے قلعہ کومحل سے ملاتے ہوئے غرناطہ کے عظیم الشان دور کی بنیاد ڈالی تھی۔

لالی چودھری روس کے علاوہ ایشیا اور یوروپ کے تقریباً تمام محل دیکھ چکی ہیں۔کہتی ہیں کہ الحمرا محل یوں لگتا ہے جیسے قدرت کے مشتاق ہاتھوں نے چاندنی رات میں صحرا کی سنہری ریت پہ نازک مرمریں ستونوں پہ خوب صورت کشیدہ کاری سے آراستہ سائبان ڈال کر دل نواز خیموں کا دیاراستوار کردیا ہو۔

اُن کا ارادہ چاندنی رات میں پھر سے الحمرا دیکھنے کا تھا، کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ الحمرا درحقیقت راتوں میں دیکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

لالی چودھری کا یہ سفرنامہ اندلس کی دلچسپ تاریخ ہے جوفکشن کی حدوں میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔

یہ سفر نامہ تخلیقی نثر کی عمدہ مثال ہے۔انھوں نے شہر قرطبہ اور مسجد قرطبہ کی اتنی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں کہ جی عش عش کرنے لگتا ہے۔وہ صاف گوئی سے اپنے بارے میں اظہار خیال کرتی ہیں۔تاریخ کا اتنا تفصیلی مطالعہ، بادشاہوں اور ملکاؤں سے منسوب کہانیاں ساری جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔کسی بھی شہر کسی بھی عبارت اور کسی بھی واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھتی ہیں۔اس کے بے شمار پہلو اجاگر کرتی ہیں۔قرونِ وسطیٰ کے اسپین پر لالی چودھری نے بہترین تحقیق کی ہے۔

لالی چودھری کو الفاظ پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔وہ اپنی عبارت کو برجستہ اشعار، پنجابی گیتوں اور قرآنی آیات کے استعمال سے دلکش بناتی ہیں۔وہ شہروں کی وجہ تسمیہ ہی نہیں بتاتیں بلکہ نام کا کس زبان سے تعلق ہے اور الفاظ بگڑ کر کیا روپ اختیار کر گئے۔اس سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔وہ انگریزی فرانسیسی الفاظ کا ترجمہ خوب صورت تراکیب کے ساتھ کرتی ہیں۔جیسے French Cusine فرانسی طباخی، Eastern عہد نہار، Radiation فضائی کرنیں وغیرہ۔لالی چودھری دیگر سفر نامہ نگاروں کی طرح ان کے اسلوب بیان میں بھی شگفتگی ہے۔وہ ہر منظر کو ایسے پیش کرتی ہیں تا کہ قاری اس کو پڑھ کر قدیم تاریخ سے آشنا ہو جائے۔ان کی زبان میں پہاڑی جھرنوں جیسا بہاؤ نظر آتا ہے۔ان کی زبان سب سے منفرد ہے جہاں جو لفظ سجتا ہو وہ لفظ چاہے کسی بھی زبان کا کیوں نہ ہو، اسے بے ساختہ استعمال کرتی ہیں۔انگریزی جس تیزی سے وہ بولتی ہیں اتنی ہی برجستگی سے برتتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رواں دواں اُردو کے دریا میں انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے ہوں۔ان کی تراکیب میں جدت اور ندرت ہے جسے وہ اس خوبی سے استعمال کرتی ہیں کہ تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

اے۔امیر النساء اور ان کا سفر نامہ ''سرحد کے اُس پار''

اے۔امیر النساء کا اردو زبان و ادب سے بڑا جذباتی رشتہ ہے۔اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔جسے وہ سفر اور حضر میں کہیں فراموش نہیں کرتیں۔اردو زبان سے ان کی ذہنی وابستگی اور قلبی لگاؤ کا اندازہ ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ان کا تعلق تمل ناڈو کے ایک مردم خیز شہر گڈیاتم کے ایک مہذب، علم پرور اور متمول گھرانے سے ہے۔ شادی کے بعد آپ الحاج ایس۔ ایم۔ ضیاء الدین احمد، فرزند رئیس میل وشارم الحاج ایس۔ ایم۔ جمیل صاحب مرحوم کی رفیق حیات بن کر میل وشارم آئیں اور یہیں پر تقریباً 36 سال سے کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔

اے۔ امیر النساء تمل ناڈو کی پہلی پردہ نشیں خاتون فن کار ہیں جنھوں نے تین سفرنامے لکھے ہیں۔ جن میں پہلا ''سفرنامہ حجاز'' دوسرا ''ارض مقدس میں چند روز'' جو بیت اللہ سے متعلق عقیدت کے اظہار اور دینی و تاریخی معلومات کی بہترین مثال ہیں۔ تیسرا سفرنامہ ''سرحد کے اس پار'' ہے۔ علاوہ ازیں ان سفرناموں کے ذریعے انھوں نے سعودی عرب اور مغربی ایشاء کے اتنے ملکوں کی سیر کرائی ہے کہ قاری گھر بیٹھے تقریباً آدھی مہذب دنیا سے واقف ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ان کے ایک سفرنامے ''سرحد کے اس پار'' کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی شکل میں سرمدی پبلیکیشنز، 8/2، سندرم لین، پرساوا کم، چینئی سے شائع ہو کر 2007 میں منظر عام پر آیا۔

اے۔ امیر النساء کا یہ سفرنامہ پاکستان کے صرف دو شہر لاہور اور کراچی کی سیاحت کی یادگار ہے۔ اے۔ امیر النسا کے ساتھ کل اٹھارہ افراد پر مشتمل محرم قافلہ تھا جس میں ان کے شریک حیات، تین عدد بھائی صاحبان مع بھابھیوں کے، چار عدد بہنیں اور اعزا و اقربا شامل تھے۔

بچپن میں گھر پر بڑوں کی زبانی پاکستان کا نام اتنی بار سنا تھا کہ پاکستان دیکھنے کی آرزو اسی وقت سے امیر النساء کے دل میں پرورش پانے لگی۔ پاکستان میں مقیم اعزا و اقربا سے ملاقاتیں نیز اردو کے تہذیبی ورثے کو دیکھنے کی دیرینہ خواہش نے آخر کار انھیں پاکستان کے لیے آمادۂ سفر کر ہی لیا۔ اس طرح آپ کا یہ سفر ماہ اپریل 2006 کی دسویں تاریخ کو شروع ہوا اور اسی ماہ کی بیسویں تاریخ کو اختتام پذیر ہوا۔

سفرنامہ ''سرحد کے اُس پار''

اے۔ امیر النساء پاکستان کی سیاحت کے بارے میں کہتی ہیں۔ کہ مجھے صرف سرزمین عرب سے محبت ہے

اس کے علاوہ مجھے کوئی سفر محبوب نہیں اور اپنا وطن مجھے اس لیے پیارا ہے کہ یہ اپنا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کافی جدو جہد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ظاہر ہے سونے کی چڑیا کو اس کے غاصب سے حاصل کرنا ہی تھا ورنہ تو گلوبل ویلیج کے سر براہوں کی غلامی ہی ہمارا مقدر ہوتی، ملک کی آزادی نے جہاں ہمیں ایک آزاد ملک کے شہریوں کی حیثیت بخشی وہیں ہمارے درمیان ایک ایسی لکیر بھی کھینچ دی گئی جس سے ایک ہی وطن کے شہری دو ملکوں میں تقسیم ہو کر اپنی پہچان مذہب کے نام پر قائم کی جب کہ عظیم شاعر علامہ اقبال نے کہا تھا ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' بہر حال اسی بندر بانٹ کو ساری دنیا کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے متنازعہ مسئلہ بنا کر رکھ دیا تھا۔جو سالوں سے ریشم کے لچھوں کی طرح الجھتا ہی جا رہا تھا۔سالوں سے الجھی ہوئی ڈور جب سلجھنے لگی تو ہمارے سابق وزیر اعظم واجپئی جی صلح کا پیغام لے کر بس یاترا کے ذریعہ ۔

وہ دن آئے کہ آنسو ہو کہ نفرت دل سے بہہ جائے

وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

کی سفیر بن کر پاکستان پہنچے اور ہمارے دل کی سرزمین پر پاکستان دیکھنے کی تمنا نے ننھی کونپل کی طرح سر ابھارا ویسے تو یہ پودا بچپن سے ہی ہمارے دلوں میں تناور درخت کا روپ دھار چکا تھا کیوں کہ اس ملک سے ہمارا دیرینہ رشتہ رہا ہے۔شیر خواری کے زمانے سے ہی جب الفاظ کے معنی و مطلب سمجھ میں آنے لگے تھے ہم نے پاکستان کا نام اتنی بار سنا ہے کہ اس ملک سے انسیت ہی نہیں اسے دیکھنے کی تڑپ بھی جاگنے لگی تھی ،صرف اس لیے نہیں کہ اس ملک سے ہماری ثقافت جڑی ہوی ہے ہمارا تہذیب و تمدن جڑا ہوا ہے بلکہ ہمارا وہ تہذیبی اثاثہ بھی اسی تقسیم کی نذر ہو گیا ہے جس کے ہم وارث ہیں۔

انڈین ایمبیسی نے ان کو صرف لاہور اور کراچی کی سیاحت کی اجازت دی تھی ۔اے۔امیر النساء نے اپنے پاکستان کے سفر کی ابتدا 10 اپریل کو اناّ ایئر پورٹ مدراس سے کی ۔ان کا طیارہ صبح دس بجے پرواز کرتا ہوا دہلی اندرا گاندھی ایئر پورٹ پہ پہنچا اور وہ عبوری کی حیثیت سے تقریباً شام کے ساڑھے سات بجے تک لاہور کے علامہ اقبال

انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتریں۔ ایئرپورٹ پر ان کے خالہ زاد بھائی مختار احمد نے جو رسیو کرنے اور لاہور گھمانے کی غرض سے آئے تھے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔

لاہور میں، علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی جدید طرز پر بنائی گئی عمارت کا جائزہ لینے لگے جس پر بجلی کے قمقمے روشن تھے شاید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں لائیٹنگ کی گئی تھی۔ لاہور پہلی ہی نظر میں خوب صورت اور منصوبہ بند شہر نظر آیا۔ وہاں پیڑوں پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام یعنی اسماء الحسنیٰ ترتیب کے ساتھ آویزاں کیے گئے تھے۔ یہ ربیع الاول کی گیارہ تاریخ تھی جشنِ آمدِ رسول ﷺ کی تیاریوں کا آغاز تھا۔

شالیمار باغ، جشن میلاد النبی ﷺ کی تعطیل تھی ان کا پروگرام لاہور کے تاریخی مقامات دیکھنے کا تھا۔ سب سے پہلے وہ شالیمار باغ دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہاں کی تاریخی عمارتیں مغل دور کی یادگار ہیں۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کو زمانۂ شہزادگی سے ہی عمارتوں کی تعمیر کا بے حد شوق تھا شالیمار باغ کشمیر کے نمونے پر ہی تعمیر کیا گیا ہے۔ مہر منگا نامی باغبان اس زمین کا مالک تھا۔ اس باغ کی آب یاری کے لیے مادھو پور سے ایک نہر کھدوائی گئی اور وہ نہر بہ اہتمام نواب علی مرواران خان لاہور تک آئی سی مغل بادشاہ نے اس باغ کی عمارت کو اشجار و گل سے ایسے سجایا کہ اس پر زمینی جنت کا گماں ہوتا تھا۔ اس باغ میں بادشاہ کے وقت صرف انگور کی بیلیں تھیں اور جس کو لوگ شالیمار باغ کہتے ہیں وہ مجموعہ تین باغوں کا ہے۔ یہ عمارت ایک سال چار مہینے اور پانچ روز میں مکمل ہوئی۔ ان کے ڈرائیور نے انھیں بتایا کہ آج عید میلاد النبی ﷺ ہے جس کی وجہ آج تعطیل ہے لہٰذا وہ وہاں کا نظارہ کیے بغیر لاہور کا قلعہ پہنچیں۔

لاہور کا قلعہ، امیر انساء اس قلعے کے اندر پیدل داخل ہوئیں بیرونی گیٹ کافی بلند آہنی دروازہ ہے۔ یہ اکبر بادشاہ کا تعمیر کردہ قلعہ ہے۔ مصور دیوار کے نام سے اس کی بیرونی دیوار مشہور ہے۔ چناں چہ اکبر کا تعمیر کردہ مکان و خواب گاہ اب تک موجود ہے عمارت سنگِ مرمر کی ہے دیواروں پر شیشے کا بیل دار کام بنا ہوا ہے۔ ایک سنگِ مرمر کی زنانہ مسجد جو اس قلعے میں گنبد دار بنی ہوئی ہے اس کو موتی مسجد کہتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا نام بدل کر موتی مندر کر دیا تھا۔ قلعہ کی شاہی عمارت میں گرمیوں سے بچنے کے لیے ایسی تکنیک استعمال کی گئی تھی کہ اندر کا ماحول

گرمیوں میں بھی خنک رہے یہ قلعہ اس جگہ تعمیر کیا گیا تھا جہاں پانچوں ندیاں ملتی ہیں۔ دریائے راوی، ستلج، چناب، جہلم، بیاس وغیرہ۔ محل کا ایک حصہ شاہ جہاں کی بیگم ممتاز محل کے لیے بھی بنوایا گیا تھا۔ امیر النساء نے قلعہ کی بلندی سے بادشاہی مسجد کا نظارہ کیا۔ جو اس شاہی دور کی یادگار ہے۔ مغرب بعد مرد حضرات میلادالنبی ﷺ سے متعلق پروگرام دیکھنے باہر نکل پڑے اور انھوں نے نمازِ عشاء ٹیلی ویژن آن کیا اور پروگرام دیکھنے لگے، اچانک دھماکے دار خبر نشر کی گئی کہ کراچی کے نشتر پارک میں منعقد محفل میلادالنبی ﷺ کے اسٹیج پر بم دھماکہ 50 جانیں تلف اور کئی زخمی سنی تحریک کے تین علماء اور کئی مذہبی اور سیاسی شخصیات کی ہلاکت وار پھر ایک قیامت کا منظر تھا۔

جو نشتر پارک میں بپا تھا لوگوں کی بھاگ دوڑ ایمبولینس کے ہارن لاشوں کے چیتھڑے زخمیوں کا بہتا ہوا خون، رضا کار تنظیموں کی امداد غرض کہ قیامت سے پہلے قیامت کا منظر تھا۔ ٹیلی ویژن کے ہر چینل سے میلادالنبی ﷺ سے کے تعلق سے ایمان افروز بیانات محفل نعت، محفل سماع نعتیہ مشاعرے۔ وہ حیرت زدہ تھیں کیوں کہ انھوں نے ساری زندگی میلادالنبی ﷺ کا ایسا جشن نہ تو دیکھا نہ تو سنا۔

کراچی کے نشتر پارک میں میلادالنبی ﷺ کے موقع پر منعقد جلسے میں دہشت گردی کی جو بہیمانہ کاروائی ہوئی اس سے نہ صرف سندھ بلکہ پورا ملک دہل گیا تھا۔ اخباری بیان کے مطابق میتوں کے تابوت پر ہرے رنگ کے کپڑے ڈالے گئے ہے تھے جس پر المدد یا رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔

پاکستان کی حالیہ صورت حال، حکمران طبقے کے آگے کئی سوال ہیں روز بڑھتی ہوئی مہنگائی سے غریب عوام ایک وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں جب کہ دوسری طرف وزیروں، سرکاری مشیروں پر شاہی اخراجات سے ملک دیوالیہ ہو رہا ہے۔

امیر النساء کہتی ہیں کہ ان کی مشتاق آنکھیں پاکستان سے وابستہ تہذیب اور زبانِ اردو کا دریا بہتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انھیں مایوسی اسی بات سے نہیں ہوئی کہ واقعی یہاں تو زبانِ اردو کا سمندر ہے جو ایک تسلسل سے بہتا ہی جارہا ہے اس کا تجربہ انھیں لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے ہی ہو گیا تھا جہاں پر تمام معلومات

اور ہدایات بزبانِ اردو وہی لکھی تھیں۔ امیر النساء اور ان کے بھائی صاحبان از راہ مذاق کہنے لگے کہ یہاں سے تمہاری زبان شروع ہوتی ہے سچ مچ اردو زبان اپنے منصب پر اس دربار میں بڑی شان اور تمکنت سے جلوہ افروز ہے۔

بادشاہی مسجد، اپنے پروگراموں کے مطابق اے۔ امیر النساء بادشاہی مسجد پہنچتی ہیں۔ جو چھٹویں مغل تاجدار اورنگ زیب نے 1673 میں تعمیر کی۔ تین سال میں یہ مسجد مکمل ہوئی یہ عالی جاہ مسجد لاہور کی قدیم مساجد سے بڑی ہے سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی ہے قلعہ لاہور کے غربی دروازے کی طرف چھوٹا سا میدان جس کو حضوری باغ کہتے ہیں چھوڑ کر مسجد کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں اور بہت بلند کرسی دیکر مسجد کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں دروازہ اس مسجد کا سنگ سرخ سے نہایت عمدہ بنا ہوا ہے۔

علامہ اقبال کا خوب صورت کا مقبرہ، بادشاہی مسجد کے احاطے میں بائیں طرف شاعر مشرق علامہ اقبال کا خوب صورت مقبرہ ہے جس کی تعمیر سنگِ مرمر سے کی گئی ہے مقبرے کے تین جانب دروازے لگے ہوئے ہیں مگر صرف ایک دروازہ کھلا ہوا ہے۔

واگہہ بارڈر۔۔۔۔۔ دو سرحدوں کا منظر، مینار پاکستان جہاں ہندو پاک کی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا تھا اس تاریخی میدان کا نظارہ کرتے ہوئے اے۔ امیر النساء واگہہ بارڈر دیکھنے گئیں جو سیدھے سرحد پر تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کی روٹی اور گوشت مرغوب غذا ہے۔ تقریباً سرحد تک بیس پچیس کلومیٹر تک کا فیصلہ طے کر کے وہاں پہنچتی ہیں۔ قابل دید منظر تھا دونوں سرحدوں کے بیچ تقریباً دس فٹ کا فاصلہ تھا ادھر پاکستانی جذباتی نعرے لگا رہے تھے اُدھر ہندوستانی اس کا جواب دے رہے تھے امیر النسا اور ان کے ساتھی پاکستان کی سرحد پر کھڑے ہو کر ہندوستان کی سرحد کا نظارہ کر رہے تھے صرف دس فٹ کا فاصلہ دونوں پڑوسیوں کے درمیان برسوں کی مسافت بن گیا تھا۔ اسی سرحد پہ کھڑے ہو کر ان کو معروف شاعر علی سردار جعفری کی طویل نظم یاد آ رہی تھی جسے انھوں نے ''صبح فردا'' کے نام سے لکھا تھا۔ ممتاز شاعر علی سردار جعفری تو صبحِ فردا کا انتظام کرتے کرتے اپنی تشنہ تمناؤں کے ساتھ دونوں سرحدوں

سے آگے اسی سرحد کی طرف نکل گئے جو صرف ایک طرفہ ہے تاہم اس سرحد پہ جو پھول، خوشبو اور رنگوں سے دلہن کی مانگ کی طرح جگمگاتی ہے۔ وہ ان کے ادھورے خوابوں میں رنگ بھرنے اور ہندو پاک تعلقات کو مزید استحکام بخشنے کے لیے اپنے پورے خاندان سمیت اس سرحد پر کھڑے ہو کر اس خواب کی تکمیل کا نظارہ کر رہے ہیں جو بڑا ہی خوب صورت اور خوش آئند ہے۔ یقیناً دشمنی کے زہر سے محبت کا شیریں چشمہ طاقتور ہوتا ہے جو دلوں کو پل بھر میں تسخیر کر لیتا ہے۔ مگر دونوں طرف کے عوام ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور جملوں کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔

بارڈر کی بلند و بالا چوکھٹ پر نمایاں طور پر لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللہُ لکھا ہوا ہے۔ فوجی بار بار درخواست کر رہے ہیں کہ وقت ختم ہو چکا ہے سرحد سے نکل جایئے۔ پھر وہ سرحد سے نکل پڑے۔ وہیں ایک خوب صورت مسجد بھی موجود ہے۔ تقریباً 200 یا 300 خواتین واگہہ بارڈر پر موجود تھیں ماشاء اللہ مسلمان خواتین پردے کی قید سے بالکل آزاد تھیں۔

لاہور کے انارکلی بازار کا منظر، یہ مارکیٹ بھی بند تھا ویسے ان کو پتہ تھا کہ سانحہ نشتر پارک کی وجہ سے سندھ حکومت کے حکم پر لاہور بھی ایک دن کے لیے بند ہے دلی میں چاندنی چوک کی طرح یہاں بھی مغل دور کی یادگار انار کلی بازار رسالوں سے اسی نام کے ساتھ موجود ہے مورخوں کے مطابق انارکلی نہایت خوب صورت کنیز بادشاہ اکبر کے زمانے کی تھی جس کا اصلی نام نادرہ تھا اس کا حسن و جمال لاثانی تھا، اور رنگ سرخ ہونے کی وجہ سے بادشاہ نے اسے انارکلی کا خطاب دیا ہوا تھا۔

دنیا کا سب سے بڑا تبلیغی جماعت کا مرکز، لاہور سے 20 یا 25 کیلومیٹر کی دوری پر تبلیغی جماعت کا مرکز رے ونڈ نامی علاقے میں قائم ہے۔ وہ کچھ ہی دیر میں وسیع و عریض مرکز کے بیرونی گیٹ پر پہنچے جس کی فصیل قلعہ نما تھی جیسے ہی سارے ساتھی امیر النساء کے اس آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئے ایک الگ ہی دنیا ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے معمولات میں مشغول تھی۔ احاطے کے اندر بسی دنیا کا جائزہ لینے لگ گئیں

وسیع وعریض میدان کے دونوں طرف دومنزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ان عمارتوں میں حجرے نما کمرے بنے ہوئے ہیں۔اونچے پاجاموں لمبے کرتوں اور گول ٹوپی پہنے لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے بےشمار حضرات قطار کی صورت میں بنے ہوئے حجروں کے اندر باہر گھوم رہے ہیں۔

مجموعی تاثر۔۔۔۔اسلامی ملک پاکستان سے متعلق،اسلامی حکومت ہونے کے ناتے پردے کی پابندی ہوگی اسلامی احکامات پر عمل درآمد ہوگا مذہب کو بنیاد بنا کر حاصل کی گئی حکومت مذہبی احکامات پر سختی سے عمل پیرا ہوگی مگر یہاں کے ماحول نے انھیں سخت مایوس کیا اور ان کی خوش فہمیوں کا جہاں لاہور پہنچتے ہی مسمار ہوگیا۔ یہاں ہر روز تقریباً دس ہزار آدمیوں کا کھانا بنتا ہے۔

لاہور کا جم خانہ کلب،کلب بہت کشادہ اور کھلے میدان میں واقع ہے حدنظر تک نشیب میں سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا وسیع لابی میں کین کے صوفوں پر آرام دہ کشن پڑے ہوئے تھے،اور یہاں کے لوگ کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ ہر قسم کے گوشت کی مختلف پکوان یہاں بہترین بنتے ہیں۔

کراچی کا طارق روڈ، یہ شاہراہ بنگلور کے کمرشیل روڈ اور حیدرآباد کے عابدس روڈ سے مشابہ ہے۔ یہاں طارق روڈ میں رابی سینٹر کافی مشہور مارکیٹ ہے جو خواتین کے ملبوسات کے لیے موزوں اور مناسب مارکیٹ ہے یہاں ملکی اور غیر ملکی کپڑے مناسب قیمتوں پر دستیاب ہیں۔

قائداعظم کا مقبرہ،کافی بڑے رقبہ پر پھیلا ہوا خوب صورت گارڈن دودھیا رنگ کے فرش اور دیواروں سے مزین کافی اونچائی پر بنی مقبرہ کی بنی عمارت جس کے چاروں طرف بیضوی شکل میں بنے جالی دار دروازے اور گہرے سبز رنگ کے پیڑ پودے عمارت کی خوب صورتی اور پاکیزگی میں اضافہ کر رہے تھے اندر کا فرش بیش قیمت سنگ مرمر سے بنا ہوا جس کے بیچوں بیچ قائداعظم کا تابوت رکھا ہوا۔چھت پر کسٹل کا فانوس عمارت کی پاکیزگی اور حسن میں اضافہ کرتا ہے۔اصل مقبرہ عمارت کے نیچے ہے صاف ستھرے اور پرسکون ماحول میں سب نے فاتحہ پڑھی اور عمارت سے باہر نکل آئے۔مقبرہ کی عمارت کے چار سمتوں میں چار دروازے لگے ہوئے ہیں جس کے چاروں

سمت سے شہر کراچی صاف نظر آتا ہے۔ مقبرے کی عمارت کے دائیں جانب بیسمنٹ میں محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی اور ریشما جناح کے مقبرے ہیں اور دوسری یادگار اشاء بطور نمائش رکھی ہوئی ہیں۔ مقبرے سے باہر سنگِ سفید کا پختہ فرش اور زینوں کے دونوں طرف ڈھلانوں میں لگے گہرے سبز رنگ کے پودے عمارت کے حسن میں چار چاند لگاتے ہیں۔ اپنے دیکھے ہوئے خوب صورت خوابوں کی تعبیر سے بے نیاز قائدِ اعظم اپنے پرسکون گوشہ میں محوِ خواب ہیں جو پرسکون ماحول اس احاطے کے اندر ہے کراچی کی ہنگامہ خیز زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کراچی کے سنڈے بازار کا خوب صورت نقشہ، انتہائی دیدہ زیب رہائشی تعمیرات بالکل سعودی اسٹائل میں تعمیر کی گئی ہیں۔ اتواری بازار ساحل سے قریب تر ہے حدِ نظر تک خیموں کا شہر بسایا گیا ہے جہاں کچھ الگ انداز میں دکانیں سجائی گئی ہیں کافی مصروف انداز میں سب خریداری کیے جا رہے ہیں۔ سنڈے بازار کی دکانوں کا سلسلہ کافی دور تک جاتا ہے۔

کلفٹن، یہ کلب کراچی کی خوب صورت تفریح گاہوں میں سے ایک ہے۔ جہاں امتیاز احمد امیر النساء کو لے کر جاتے ہیں۔ سجا سجایا لان جس میں جدید طرز کا ریستوران بنا ہوا ہے یہ ساحل سمندر کا پچھلا حصہ ہے جہاں صاف ستھری ریت جو بھوری چینی سے مشابہ ہے، بہت بھلی لگ رہی ہے صفائی ستھرائی اور نظم وضبط کا بہترین مظاہر سیاحوں پر خوش گوار اثر چھوڑتا ہے جگہ جگہ پڑی ہوئی میز کرسیاں جس میں براجمان بنی سنوری خواتین صاف ستھرے اور بہترین لباس میں ملبوس مرد، خوب صورت اور صحت مند بچے جن کے چہروں سے نا معصومیت کے ساتھ امارت بھی جھلکتی ہے۔ یہ شہر کراچی کی خوب صورت تصویر ہے۔ پھر وہاں سے پارک ٹاور پہنچے وہاں ایک شاپنگ پلازہ ہے، پاکستان میں عروسی گہنے بہت خوبصورت بنتے ہیں جھومر ٹیکہ اور نتھ وغیرہ یہاں زیادہ تر جیولری ملٹی کلر نگینوں اور موتیوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

ٹیپو سلطان میوزیم۔ کراچی کا اردو بازار، یہاں ٹیپو سلطان کا میوزیم ہے اور ان سے متعلق یادگاریں موجود ہیں۔ اردو بازار ایک طویل سلسلہ ہے اردو کی دکانوں کا۔ وہ سارے نظائر بنظر عمیق اے۔ امیر النساء نے اپنے

سفرنامے میں تحریر کیے ہیں۔ جوانھوں نے بچشم عمیق مطالعہ سفرنامہ ''سرحد کے اُس پار''یعنی پاکستان کے شہر کراچی اور بہشت نما لاہور میں کیا ہے۔

اے۔ امیر النساء کے اس سفرنامے میں ہم کو پاکستان کی معاشرت ہی کی جھلکیاں نظر نہیں آتی بلکہ موجودہ پاکستان کے سیاسی وانتظامی حالات اور نظم وضبط کی صورت حال اور عسکریت پسند سرگرمیوں کے بھی نظارے ملتے ہیں۔ انھوں نے بڑی خوصورتی سے دہشت اور امن کی بدلتی صورتوں کا جائزہ لیا ہے کہ کس طرح جشن وجلوس کی مسرتوں میں اچانک بم دھماکوں سے دہشت ورنج والم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ بدلتے موسم کی طرح امن وامان کی صورت حال بھی پاکستان میں بدلتی رہتی ہے۔ جہاں پاکستان کی خوب صورتی، قدرتی مناظر، تاریخی عمارات، اسلامی آثار وتمدن اور جمعیت سے امیر النساء نے خوش گوار اثر قبول کیا ہے۔ وہیں جرائم کی کثرت، رشوت ستانی، بدنظمی، جہالت، افلاس اور عوام کے غیر اسلامی طرز عمل کے لیے وہ شاکی بھی ہیں۔ ان کے لہجے کی شیرینی میں اچانک تلخی آنے لگتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کھری کھری سنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ حقیقت پسندی سفرنامے کی جان ہے اور حقیقت پسندی ہی سفرنامے کی صنف کی معراج ہوتی ہے۔

امیر النساء نے پاکستان کو بہ حیثیت ''اسلامی ریاست'' جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پاکستان میں جوزور وشور مذہب کا ہے یہ دراصل ایک کلچر ہے جس میں روحانیت کا حصہ بہت کم ہے اگر موازنہ سے کام لیا جائے تو ہمارے پاس ہندستان میں یہ زور وشور جو اصل میں مذہب کا نہیں کلچر کا ہے۔ لیکن مذہب کی بنیادی تعلیمات پر ہمارا عمل زیادہ استوار ہے۔ پاکستان کی معاشرت کو شریعت اسلامی کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد امیر النساء نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دکھایا ہے۔ انھوں نے پاکستانی عوام کی مذہبی معتقدات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے اور نصوص شرعیہ کی مدد سے ایک منصفانہ تجزیہ پیش کرنے کی بھرور کوشش کی ہے۔ امیر النساء کو پاکستان پسند نہیں آیا۔ اس لیے پسند نہیں آیا کہ اسلامی ریاست کے نام پر وہاں اسلامی قانون صحیح معنوں میں لاگو نہیں ہے۔ وہاں کے عوام میں اسلامی جذبہ اور حُریت محض چند کھوکھلے

نعروں اور رسومات کا نام ہے اور جو معاشرت وہاں پائی جاتی ہے وہ اسلامی معاشرت نہیں ہے۔

اے۔امیر النساء کی تحریر میں سادگی، سچائی، بے ساختگی ایک طاقت بن کرا بھرتی ہے اور قاری کو زیر کرلیتی ہے۔ان کی تحریر کا لب ولہجہ نرم رود ریا کے مانند ہے مگر قلم میں اتنی بے با کی ہے کہ وہ سچ بات کہنے سے کہیں گریز نہیں کرتیں۔انھوں نے جہاں کوئی ایسی چیز دیکھی یا کوئی ایسی بات سنی جو ان کی طبیعت سے مناسبت اور مزاجِ اسلامی سے مطابقت نہ رکھتی ہوتو اس پر ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا ہے۔وہ اپنے سفرنامے میں انگریزی الفاظ کو خوب مشاقی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اس سفرنامہ میں نظر آتی ہے وہ اس کے روزنامچہ والا انداز ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو امیر النساء نے اس صنف میں کیا ہے۔جس طرح روزنامچہ میں حال کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح جا بجا حال کے صیغے میں بات کی گئی ہے۔جس سے بیان میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور سفرنامہ اس طرح لکھا گیا ہے۔ جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتا ہے۔ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اس سفرنامے میں ان کا تنقیدی شعور عروج پر نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری اور ان کا سفرنامۂ حج ’’شہر ہائے نور‘‘

مذکورہ بالا عام سفرناموں کے علاوہ اس مقالے میں حج کے تعلق سے سفرنامہ ’’شہر ہائے نور‘‘ ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ حج کے سفرنامے اپنے مقاصد کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوتے ہیں یہ سفرنامے عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ میں سرشار ہونے کی وجہ سے عقیدت مندانہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ موضوع کی طرح ان کے اسالیب بیان میں بھی جذبات عقیدت کی فراوانی، احساس ندامت کا روحانی سکون، رِقّت وانبساط کی امتزاجی کیفیت انھیں عام سفرناموں سے مختلف کردیتی ہے۔

سفرنامۂ حج ڈاکٹر نیلوفر ناز کی دیرینہ خواہشوں کا مرہونِ منّت ہے۔ حج کی سعادت ان کو 2004 میں

نصیب ہوئی اور یہ سفر نامہ انھوں نے اپنی اس پاکیزہ سیاحت کے بارے میں قلمبند کیا مگران کا یہ سفرنامۂ حج بنام ''شہر ہائے نور'' 2010ء میں قادری پبلی کیشن ، اے گوگجلی باغ۔نزدیک پولی ٹیکنیک کالج، سری نگر سے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظرعام پر آیا۔فکشن میں خصوصی شہرت ومقبولیت کی حامل ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اس سفر نامہ میں بھی زبان وبیان اورندرت بیان کی شگفتگی کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آئی ہیں۔

نیلوفر نازنحوی قادری 1958 میں کلاشپورہ اور خانقاہ معلیٰ کے درمیان کے علاقے ''نیلگری باغ''میں پیدا ہوئیں۔۔نیلوفرنازنے بی اے آرٹس مضامین میں پاس کیا۔اردواور فارسی سے خاصی دلچسپی تھی۔فارسی میں ایم اے کیااور اسکے بعدایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی۔ایم فل کی ڈگری غنی کشمیری کی حیات اورشاعری پرمشتمل تھی۔پھر1985 میں شادی ہوگئی۔1984 میں ایم فل کی ڈگری ملنے کے بعد1993 میں ایک بڑے وقفے کے بعدبہ حیثیت استادفائزہو گئی۔2005 میں''شاہنامہ کشمیرکی تحقیق وتدوین''پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔بچپن سے ہی ان کوافسانے اورانشائیے لکھنے کا شوق تھا۔ان کا پہلا افسانہ''سنگدل خدا'' 1984 میں روزنامہ''سرینگر ٹائمز''میں چھپا۔۔پھر یہ سلسلہ جرائدورسائل میں چلتارہا۔2002 سے کتابیں لکھنےاور چھپانے کا کام باقاعدگی سے شروع ہوگیا۔

اسکے بعد انہوں نےغنی کشمیری،شہر ہائے نور،فارسی کی طرف دوسرا قدم،جیسی کتابیں لکھیں۔ان سب کتابوں کی بہت پذیرائی ہوئی۔افسانوی مجموعہ''چنار کے برفیلے سائے''اور''خاموش آسمان''قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

سفرنامۂ حج ''شہر ہائے نور''

اس سفرنامہ کےتعلق سے وہ بیان کرتی ہیں۔انسانی زندگی پرکوئی بھروسہ نہیں۔آج ہے توکل نہیں۔اس دنیائے فانی کی بےثباتی کوسمجھنے کے بعدہی میرے دل میں حج بیت اللہ پر جانے کا شوق اُمنڈ آیا۔میں ہردم یہ سوچا کرتی تھی کہ اگراس سال نہیں ہوسکتا تو کیا معلوم زندگی نے اگلے سال تک وفانہ کی تو کیا ہوگا۔میں ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ

سے دعا کرتی تھی کہ موت تو کسی کی ٹل نہیں سکتی ہے، مگر اے اللہ تعالیٰ مجھے حج بیت اللہ پر جانے سے پہلے، اور پیارے نبی ﷺ کا روضہ مبارک دیکھنے سے پہلے اپنے پاس نہ بلائیو۔ اللہ تعالیٰ تو بڑا کارساز ہے اس نے میری فریاد قبول کر لی اور مجھے آخر کار اپنے شہر بلا ہی لیا، اور اپنے محبوب ﷺ کی گلیوں میں آنے کی دعوت دی۔ اور پھر وہ آخر کار وہ حج بیت اللہ کے مبارک سفر کی جانب رواں دواں ہوئیں۔ اس سفر نامہ کو لکھنے کا مقصد ایک حج گائڈ کے طور پر مفید ثابت ہونے کے علاوہ اپنے دلی جذبات اور کیفیات کو محفوظ کرنا بھی تھا۔ اس سفر نامہ کے نام رکھنے کی تجویز میں وہ لکھتیں ہیں کہ اس سفر نامہ کا نام ''شہر ہائے نور'' یعنی نور والا شہر اس وجہ سے رکھا کہ جو نور ان دونوں شہروں، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں ہے آج تک انھوں نے کہیں اور نہیں دیکھا اور نہ کہیں دیکھنے کا تصور بھی ہے۔ جن شہروں میں خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ ہے وہ حقیقت میں شہر نور الانوار ہیں۔

گھر سے ہی عورتوں کو احرام پہن کر جانا ہوتا ہے اور مردوں کو ایئر پورٹ پر احرام باندھنا ہوتا ہے۔ عورتوں کا احرام عام قسم کے کپڑے ہیں اور مردوں کے لیے دو چادر احرام میں شامل ہیں۔ نیلوفر ناز نحوی نے صبح میں اپنے قافلے کے ساتھ اپنے گھر ہی سے احرام باندھ کر دسمبر کی 13 تاریخ بروز پیر 2004ء میں پہلے دن کے دوسرے قافلے کے ساتھ سری نگر ایئر پورٹ سے اپنے سفر کی ابتدا کی۔ ان کی فلائٹ دو بجے کی تھی۔ تین گھنٹے ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے بعد وہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے جدہ ایئر پورٹ پہنچیں۔ جدہ ایئر پورٹ سے بس کے ذریعہ وہ مکہ شریف کے لیے روانہ ہوئیں۔ لوگوں کا اژدہام ائیر پورٹ ہی سے معلوم دیتا تھا مگر حاجیوں کے لیے سہولت فراہم کرنے کے لیے حکومت عرب نے خاصہ بندوبست کر رکھا تھا مگر پھر بھی یہ سارا سفر صبر ہی پر منحصر تھا۔

حجاج کی رہنمائی معلمین کر رہے تھے۔ جدہ ائیر پورٹ پر پوری رات حج کے متعلق ہدایات کو جاننے میں گزر گئی وہاں ہر ایک کو ایک کارڈ دیا گیا جس میں مکتب کا نمبر، مکہ کا ہاؤس نمبر، بلڈنگ نمبر کمرہ نمبر وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ نیلوفر ناز کا مکتب نمبر 26 تھا۔ معلم نے کرسیوں پر بٹھا کر سارے قافلے والوں کی گنتی کرنے کے بعد بسوں میں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ بس میں بیٹھ کر لبّیک لبّیک کی صداؤں میں ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد مکہ شریف پہنچے۔

جیسے جیسے مکہ ان کے قریب آ رہا تھا مسافروں کی چیخیں نکل رہیں تھیں۔ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مینار یہ کیسے ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا تھا۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کیا واقعی ہم اللہ کے مہمان، اللہ کے شہر پہنچ گئے۔ معلموں نے کہا کہ پہلے اپنے ڈیرے پر سامان رکھواس کے بعد عمرہ کے لیے کعبہ شریف جائیں گے۔ جب مکہ میں پہنچے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔جلدی جلدی بسوں سے سامان اتار کر کمرے میں رکھا اور ہوٹل کے دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔معلم نے کہا کہ سب ایک جگہ جمع ہو جاؤ میں تمھیں اپنے ساتھ عمرہ کرانے لے چلتا ہوں۔معلم کی اقتدا میں سب قافلے والے اس کے پیچھے پیچھے لبیک کہتے ہوئے چلتے رہے۔وہی دو مینار جو بس میں ان کو نظر آئے تھے وہ اب قریب سے نظر آ رہے تھے۔ یہ کعبہ شریف دروازہ نمبر ایک جس کا نام باب الملک عبدالعزیز تھا۔ جتنا جتنا وہ اندر چلتے گئے اور خانۂ پر نظر پڑی تو ایسا لگا کہ جیسے سارا جسم سُن ہو گیا ہو۔خانۂ کعبہ کا طواف کرنے میں ان کو پورے تین گھنٹے لگے۔بعدۂ ڈیرے پر آ کر احرام اتار کر آرام کرنے کرنے لگے۔چودہ تاریخ کی شام کو عشاء کے بعد وہ مدینہ شریف کی طرف روانہ ہوئیں۔مدینہ شریف کے قیام کی مدت آٹھ روز کی تھی۔

مدینہ شریف کی طرف، قافلہ بسوں پر روانہ ہوا جب مدینہ کی پاک گلیوں میں پہنچے تو فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ معلم کے کہنے پر تمام مسافروں نے اپنے اپنے ہوٹل کے کمروں کا رخ کیا اور اس کے بعد فجر کی نماز ادا کی گئی۔نیلوفر ناز کا جس ہوٹل میں قیام تھا وہاں سے گنبدِ خضریٰ کا ایک مینار نظر آ رہا تھا۔ طے یہ تھا کہ انھیں آٹھ دن یہاں رہنا ہے۔ اور چالیس نمازیں با جماعت یہاں ادا کرنی ہیں۔اس وجہ سے وہ چاہتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت مسجد نبوی ﷺ میں گذاریں۔مسجد نبوی ﷺ میں پہنچ کر آنکھیں چندیا جاتی تھیں۔ وہاں کے نور کو دیکھیں، جاروں کو دیکھیں، وہاں کے سنگ مرمر کو دیکھیں، وہاں کے قالینوں کو دیکھیں، وہاں کے ستونوں کو دیکھیں، وہاں کی چمچماتی بجلیوں کو دیکھیں، وہاں کی سرکتی چھتوں کو دیکھیں، یا وہاں کے سکون اور سکوت کو دیکھیں۔مغرب اور عشاء کے درمیان ان کو اس بات کا علم ہوا کہ مسجد نبوی ﷺ مسجد الحرام کی طرح ساری رات کھلی نہیں رہتی ہے، بلکہ عشاء کے بعد بند ہو جاتی ہے۔اور تہجد سے پہلے کھل جاتی ہے۔مسجد کی خوبصورتی اور آرائش وزیبائش خلد نشین ہے۔اس کے ستونوں کے اندر ائیر کنڈیشن

ڈالا گیا ہے۔اس مسجد میں کبھی کبھی چھتیں سرک جاتی ہیں۔معلوم ہوا کہ اس مسجد میں چھتیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ جب بہت زیادہ گرمی ہو جاتی ہے تو آٹو میٹک (خود بہ خود) چھت اپنی جگہ سے سرک جاتی ہے اور جب درجہ حرارت پھر سے کم ہو جاتا ہے اور ٹھنڈ ہونے لگتی ہے تو چھت واپس اپنی جگہ پر آتی ہے۔چھت سرکنے پر جب آسمان نظر آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برسنے کے لیے چھت کھل جاتی ہے۔

اسی آٹھ دن کے وقفے میں نیلوفر ناز اوران کے قافلے والے ایک دن مدینہ شریف کی چند مشہور جگہوں پر بھی جانا چاہتے تھے۔جن کو زیارت کہتے ہیں۔ سنا گیا کہ ہر ہفتہ کو وہاں گاڑیوں کی قطار لگ جاتی ہیں جو ''زیارت زیارت'' کہہ کر زیارت گاہوں پر لے جاتی ہیں۔

مدینہ شریف کی ایک سب سے اچھی چیز جو دل کے تاروں کو چھو دیتی ہے اور جسم کی ساری رگوں میں سرایت کر جاتی ہے وہ مسجد نبویﷺ کی اذان ہے۔

روضۂ اقدس، مسجد نبویﷺ کی ابتدائی تعمیر خود رسول اللہﷺ کے دست مبارک سے اور انہی کی نگرانی میں ہوئی۔اس کی تعمیر کے بعد آپﷺ نے ازواج مطہرات کے لیے حجرے بنوائے۔مسجد نبویﷺ کے بالکل متصل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارک تھا، یہی آنحضورﷺ کی آخری آرام گاہ ہے۔اور اسی کو روضہ اقدس بھی کہتے ہیں۔اس میں سر مبارک مغرب کی جانب، قدمین شریفین مشرق کی جانب اور روئے انور قبلہ کی طرف جنوب کی سمت میں ہے۔13 ھجری میں خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضورﷺ کے قریب یو دفن کیا گیا ہے کہ ان کا سر مبارک حضورﷺ کے سینۂ مبارک کی سیدھ میں ہے۔23 ھجری میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خصوصی اجازت سے روضۂ اقدس کے اندر ہی اس طرح دفنایا گیا کہ ان کا سر مبارک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینۂ مبارک کی سیدھ میں ہے۔یہاں ابھی ایک قبر کے لیے جگہ خالی ہے۔جو آنحضورﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مخصوص فرمائی ہے۔جب وہ نزول کے بعد اپنی مدت پوری کر کے واصل بحق ہونگے تو یہیں مدفون ہونگے۔

ریاض الجنۃ، ریاض الجنۃ مسجد نبوی ﷺ کا وہ انمول حصہ ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ حصہ جنت کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے۔ ایک حصہ کی حدود متعین کرنے کے سفید رنگ کے آٹھ ستون لگے ہیں اوراس کے درمیان سفید قالین بچھے ہیں، جہاں دو رکعت نماز ادا کرنا باعث ثواب ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہتے ہیں جو وہاں نماز ادا کرے گا اس نے جیسے جنت میں نماز پڑھی۔ اس کے سامنے ایک محراب بنا ہے جس پر محراب النبی ﷺ لکھا ہوا ہے۔

زیارتیں، مدینہ شریف میں جیسا کہا گیا ہفتہ کے دن فجر نماز کے بعد بسیں اور ٹیکسیاں مسجد نبوی ﷺ کے صحن مبارک کے باہر لگی ہوتی ہیں۔ اور زیارت زیارت پکارتی رہتی ہیں۔ مدینہ شریف کی مشہور اور تاریخی جگہوں کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ مدینہ منورہ میں چند مساجد ہیں، جہاں پر سید المرسلین ﷺ یا آپ ﷺ کے جان نثاروں نے نماز ادا کی ہے۔ ان مساجد کو نئے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے انہیں جگہوں کی زیارت کرائی گئی۔ جن میں چند مخصوص مقامات قابل ذکر ہیں۔

مسجد قبا۔۔ یہ مسجد مدینہ شریف کے جنوب میں مسجد نبوی ﷺ سے کوئی تین میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہ مسلمانوں کی اولین مسجد ہے۔ حضور پر نور ﷺ نے ہجرت کے موقع پر اپنے جاں نثار صحابہؓ کرام کو ساتھ لے کر اپنے دست مبارک سے اس کی بنیاد رکھی۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی وقار ہے کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد قبا آیا اور یہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے لیے ایک عمرہ کا ثواب ہے۔ مسجد الحرام، مسجد نبوی ﷺ، اور مسجد اقصیٰ (یروشلم کی مسجد جو قبلہ اول تھی) کے بعد مسجد قبا ہی دنیا بھر کی مساجد سے افضل ہے۔

مسجد قبلتین ۔۔ مدینہ منورہ کے شمال میں مغرب میں وادی عقیق کے قریب اونچائی پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تحویل قبلہ پر اسی مسجد میں عین نماز میں دو رکعت قبلہ اول بیت المقدس کی طرف اور باقی دو رکعت بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی۔ اور اسی نسبت سے یہ مسجد قبلتین کہلائی گئی۔

مسجد جمعہ۔۔قبا کے راستے میں مشرق کی جانب اس مسجد میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی گئی تھی۔

مسجد ذباب۔۔ یہ مسجد جبل احد کے راستے میں بائیں جانب جبل ذباب پر واقع ہے۔ایک روایت کے مطابق غزوۂ خندق کے دوران آپ ﷺ کا خیمہ اسی جگہ نصب تھا۔

جبل اُحد۔۔ان مساجد کے علاوہ ہمیں جبل احد لیا گیا۔ جہاں پر جنگ احد لڑی گئی تھی۔اس وقت وہاں پر ایک چھوٹا سا پہاڑ کھنڈرات کی صورت میں نظر آتا ہے۔اور اسی کے ساتھ شہدائے احد کا مزار ہے۔ یہ مدینہ منورہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔حضور پرنور ﷺ نے احد کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''احد ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم احد سے محبت کرتے ہیں''۔آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اکثر اس پہاڑ پر چڑھتے تھے اور دل مبارک کو فرحت فرماتے۔

جنت البقیع۔۔ یہ مدینہ شریف کا مشہور قبرستان ہے۔ جو مسجد نبوی ﷺ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس میں مدفون ہستیوں کے لیے جنت کی بشارت ہے۔اس میں صحابۂ کرام کی تعداد ایک روایت کے مطابق دس ہزار ہے۔اس میں دوسرے اہل اللہ بھی آرام فرما رہے ہیں۔اور ان کے علاوہ متعدد امہات المومنین، تینوں صاحب زادیاں اور فرزند ارجمند حضرت ابراہیم اور حضور ﷺ کی پوپھیوں کے مزارات شامل ہیں۔ (اس مزار میں اب عورتوں کا جانا منع ہے۔)۔ان تمام زیارت گاہوں سے بارہ بجے واپس مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

روانگی سے پہلے اپنے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ پاک پر جا کر ان کو ایک بار پھر درود وسلام بھیجنا ضروری سمجھا۔اپنے دل کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہوئے نیلوفر نازنحوی کہتی ہیں کہ گنبد خضریٰ کو دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔واپسی کا منظر آنکھوں سے نہ اوجھل ہونے والا منظر تھا اس کی یادیں ایسی ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوسکتیں۔ایک شاعر طیبہ سے رخصتی کے غم کو جذبات دل میں مستغرق ہو کر یوں بیاں کرتا ہے۔

طیبہ سے لوٹنا کسی عاشق سے پوچھئے

ایسا لگے کہ روح بدن سے گزر گئی

خانۂ کعبہ پہنچے کے بعد دوبارہ سب سے پہلے پھر سے عمرہ ادا کرنا تھا۔احرام میں تو تھے ہی ایک بار پھر خانۂ کعبہ کا طواف کیا جو حجرہ اسود کے بوسہ سے شروع ہوتا ہے۔طواف کیا۔مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز بھی پڑھی۔زمزم پیا۔صفا اور مروہ کی سعی بھی کی۔اس کے بعد بال کاٹے اور رات کے بارہ بجے عمرہ سے فارغ ہوگئے۔خانۂ کعبہ کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہاں کا طواف ہے۔اگر آپ ساری دنیا گھومیں خانہ کعبہ صرف اور صرف سعودی میں ہے۔اور طواف ایک ایسی عبادت ہے جس کو آپ دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں کر سکتے۔ہم ہر جگہ ہر عبادت کر سکتے ہیں۔مگر طواف نہیں۔اس وجہ سے خانہ کعبہ کا آپ جتنی بار طواف کر سکتے ہیں کیجیے۔نیلوفر ناز کہتی ہیں کہ خانہ کعبہ کو گھنٹوں تک دیکھتے رہیے مجال ہے کہ آپ کی آنکھیں تھک جائیں۔

مدینہ شریف کی طرح یہاں بھی کعبہ شریف کے باہر ٹیکسیاں، گاڑیاں، اور بسیں لگی ہوتی ہیں اور یہاں بھی زیارت زیارت چلاتے رہتے ہیں۔یہ گاڑیاں عرفات، منیٰ، مزدلفہ، جبل نور، غار ثور، غار حرا، اور جمرہ وغیرہ لے جاتی ہیں۔دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد یہ طے تھا کہ ان کے ساتھ یہ سب جگہیں دیکھیں گے۔ظہر کے بعد وہ آئے اور سب قافلے والوں کو گاڑیوں میں بٹھا کر لے گئے۔جبل نور، غارِ حرا، غار ثور پر گئے، اور اوپر جانا شروع کیا۔ایک عجیب سی چاہت تھی۔حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مبارک ہستی کا تصور دل میں جاگزین تھا کہ وہ ان پہاڑوں پر کیسے چڑھ چڑھ کر ان میں عبادت کرتے تھے۔

حج کا پہلا دن 8/ذی الحجہ

حج تمتع کرنے والے (جو حج اور عمرہ ایک ہی سفر میں کریں) اس دن علی الصبح نہا دھو کر احرام باندھا اور حج کی نیت کی۔پھر انھوں نے طواف خانۂ کعبہ کیا اور اپنی اپنی بسوں کی طرف جانے لگے تاکہ منیٰ کی طرف روانہ ہوسکیں۔منیٰ پہنچ کر کچھ الگ ہی سماں نظر آتا ہے۔ہزاروں لاکھوں خیمے (ٹنٹ) سفید رنگ کے ایک جیسے۔صرف خیموں پر نمبر درج ہے۔کون کہاں سے جائے کچھ معلوم نہیں پڑتا۔اللہ تعالیٰ کی ہی رہبری ہے ورنہ انسانوں کا جم غفیر میں لوگ کہاں

جائیں اور کیا کریں اور یکسو منظر میں اپنا خیمہ تلاش کیسے کیا جائے۔ آخر کار وہ اپنے خیمے میں آسانی کے ساتھ پہنچ گئیں۔

منیٰ پہنچ کر پانچ نمازیں ادا کرنی ہیں۔ 8/ذی الحجہ کی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ بعدہٗ 9/ذی الحجہ کی فجر نماز ادا کرنا سنت ہے۔ منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں نماز قصر کرنا مسنون ہے۔ اس بات کی کوشش رہنی چاہیے کہ مسجد خیف میں باجماعت ادا کی جائیں۔ اس کے علاوہ تلبیہ، تلاوت، تسبیح، تہلیل، توبہ واستغفار اور درود واذکار میں مصروف رہنا چاہیے۔ فضول اور بے مقصد مشاغل سے پرہیز ہونا چاہیے۔

دوسرا دن۔ 9/ذی الحجہ (یوم عرفہ)

یوم عرفہ رکن اعظم کی ادائیگی کا دن ہے۔ طلوع آفتاب کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہونا چاہیے۔ طلوع سے پہلے جانا سنت کے خلاف ہے۔ راستے میں بلند آواز سے تلبیہ پڑھنے کے علاوہ خشوع وخضوع کے ساتھ ذکر و اذکار اور دعا میں مصروف رہنے کی تلقین ہے۔

میدان کے بالکل کنارے پر مسجد نمرہ ہے۔ جس کے متصل بطن عرفہ نامی وادی ہے جو عرفات کے میدان سے خارج ہے۔ اگر بے خبری میں قیام کرنے والے میدان عرفات میں داخل نہ ہو جائے تو ان کا وقوف صحیح نہیں ہوگا۔ اسی لیے حکومت سعودی نے میدان عرفات میں نشانات لگا کر اس کی حدود کو واضع کیا ہے۔ تاکہ حجاج کرام ان حدود کے اندر بیٹھ کر ہی اپنا وقوف درست کر لیں۔

مسجد نمرہ میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جہاں تک امام کی آواز آئے باجماعت امام کے ساتھ پڑھنا۔ اس کے علاوہ اپنے اپنے خیموں میں بھی اور میدان عرفات میں بھی نماز جائزہ ہے مگر باجماعت۔ اور اس کے بعد وقوف کرنا جائز ہے۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ الحج عرفہ (میدان عرفہ میں وقوف کرنا ہی حج ہے۔)

اس کے بعد معلم کی ہدایت کے مطابق بسوں میں بیٹھ کر عرفات گئے۔ اس میدان تک پہنچنے کی مسافت 9 کلومیٹر کی ہے جس کو اکثر لوگ پیدل ہی طے کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر مسجد نمرہ میں یا اس سے باہر ظہر اور عصر

اکھٹے پڑھنا ہوتا ہے۔ یہ نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے امام کی اقتدا میں ادا کی جاتی ہیں۔ جب یہ لوگ میدان میں پہنچتے ہیں تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نماز تو ختم ہوگئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے ایک امام کو منتخب کر کے نماز ظہر اور عصر ادا کی۔ اور پھر اپنی اپنی چٹائیاں بچھا کر وقوف عرفات کیا۔ اور پھر ایک جگہ متعین کرنے کے بعد انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت خشوع وخضوع کے ساتھ کرنا شروع کی۔ سورج غروب ہونے کے بعد عرفات کے میدان کو چھوڑ کر مزدلفہ کی طرف مغرب کی نماز ادا کیے بغیر روانہ ہوئے۔ روانگی سے پہلے سورج کے ڈھلنے تک کھڑے رہ کر قبلہ رو دعائیں کیں۔ عرفات سے چل کر مزدلفہ میں رات کو قیام کیا اور راستے میں تلبیہ، تکبیر، استغفار، درود شریف اور دعائیں سب کی زباں پر جاری تھیں۔ مزدلفہ کی پوری وادی وقوف کی جگہ ہے۔ مگر وادئ محشر میں قیام کی ممانعت ہے۔ (سعودی حکومت نے تختی لگا کر اس وادی کی نشاندہی کی ہے۔) کیوں کہ 545 گز کے فاصلے پر مشتمل مزدلفہ اور منیٰ دونوں سے خارج اس وادی میں ابرَہہ کے لشکر اصحاب فیل پر عذاب الٰہی ہوا تھا۔

مزدلفہ میں 10/ذی الحجہ کی صبح صادق تک ٹھہرنا سنت موکدہ ہے اور طلوع آفتاب تک ٹھہرنا واجب ہے۔ اس کے بعد یہاں کی وادی میں کنکریاں جمع کرنے میں مشغول ہوگئے۔ یہاں جمرات کی رمی کے لیے بڑے دانے یعنی چنے کے برابر 49 یا 70 کنکریاں چن لینی تھیں۔ اس کے لیے کوئی خاص جگہ مخصوص نہیں ہے۔ اس لیے ان کو جہاں بھی پہاڑیوں پر جگہ ملی انھوں نے ڈیرہ جمالیا۔ اور کنکریاں جمع کرنے میں لگ گئے۔

تیسرا دن 10/ذی الحجہ (یوم النحر)

فجر کی نماز کے بعد یہاں سے نکل کر منیٰ اپنے اپنے خیموں میں جا کر انھوں نے سامان چھوڑ کر جمرہ عقبہ (یعنی بڑے شیطان) پر رمی کی۔ اس دن صرف سات کنکریاں ایک ہی شیطان پر مارنی ہوتی ہیں۔ جوتے اور چپلیں مارنا جہالت کی علامت ہے۔ ان کے مارنے سے رمی نہیں ہوتی۔ پھر اسی دن جمرے پر رمی کرنے کے بعد قربانی کرنا واجب ہے جو انھوں نے کی۔ قربانی کا جدید طریقہ جو اب سعودی میں رائج ہوگیا ہے وہ یہ ہے کہ حاجی صاحب جانور کی قیمت پہلے ہی حکومت کی جانب سے مقرر کردہ رقم بینک میں جمع کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں 10/ذی الحجہ کو جمرہ

عقبہ کی رمی کے بعد حاجی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔قربانی کا وقت گیارہ بجے کا ملا تھا مگر اس کی ادائیگی میں ایک بج گیا۔اور مسجد خیف سے اذان کی آواز سنائی دی۔مسجد خیف جونز دیک میں تھی اس میں جا کر جمعہ کی نماز ادا کی پھر پیدل چل کر قافلہ اپنے ڈیروں کی جانب واپس آ گیا۔

10/ذی الحجہ کو طواف افاضہ جسے طواف زیارت بھی کہتے ہیں یہ ایسے واجبات میں سے ہے کہ جب تک یہ طواف نہ ہوگا مرد پر بیوی بھی حلال نہ ہوگی اور حج بھی مکمل نہ ہوگا۔طواف زیارت کی سعادت بھی اسی دن حاصل کرنا افضل ہے۔طواف وسعی کرنے کے بعد پھر منیٰ واپس آنا ہوتا ہے۔مگر پورا قافلہ اتنا تھک چکا تھا کہ وہ سب لوگ منیٰ میں ہی قیام کرتے رہے اور اس دن ان کو طواف زیارت کی سعادت میسر نہ ہو سکی۔

چوتھا دن 11/ذی الحجہ

اس دن تینوں جمرات (شیاطین) کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کر شیاطین کو کنکریاں مارنے کے لیے نکلے۔بھیڑ بہت زیادہ تھی مگر خدا کا شکر تھا کہ ان کو قریب سے ہی شیاطین کو کنکریاں مارنے کا موقع دستیاب ہوا۔مغرب کی اذان کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اب طواف زیارت کرنی چاہیے۔چناں چہ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد ہی سب لوگ خانہ کعبہ کی طرف گاڑی میں سوار ہو کر پہنچ گئے۔طواف زیارت سے فراغت کے بعد منیٰ واپس آئے۔کیوں کہ ان دونوں راتوں میں منیٰ میں ہی قیام کرنا ہوتا ہے جس سے وہ صبح طلوع ہونے تک منیٰ میں پہنچ گئے۔

پانچواں دن۔12/ذی الحجہ

صبح ہوتے ہی جمرات کو پتھر مارنے کے بعد وہ واپس منیٰ کے ڈیرے پر چلے آئے۔نماز ظہر سے قبل ہی ان کو منیٰ چھوڑ دینا تھا جلدی سے سامان پیک کیا اور خانہ کعبہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

خدا کا شکر ہوا کہ ان کے پانچ دن حج کے صحیح سلامت گزر گئے۔یہی پانچ دن اصلی حج کے ہوتے ہیں۔تھکا دینے والے محنت کے پانچ دن،مشقت کے پانچ دن،عبادات کے پانچ دن،اذکار کے پانچ دن،دعاؤں کے پانچ

دن،توبہ واستغفار کے دن،شیطان کو مارنے کے دن،درود وسلام کے دن،حمد وثنا پڑھنے کے دن،تلاوت کرنے کے دن اوراس کے علاوہ اندر کے شیطان کو مارنے کے دن اور پھر واپس بیت اللہ۔

اس کے دوسرے دن عصر کے وقت تین بجے کے لیے وطن واپس ہونا تھا مگر اس سے پہلے طواف وداع کرنا ضروری تھا۔ یہ آخری طواف تھا بھیڑ اتنی تھی کہ لگتا تھا کہ زندہ بچ نکلنا مشکل ہوگا مگر خدائے تعالیٰ کی رحمت سے طواف وداع میں آسانی ہوگئی۔ وہاں دو رکعت نماز نفل ادا کی خوب آہ وزاری کر کے دعائیں مانگیں،آب زمزم کو پیا۔اور اپنے مولیٰ سے رخصتی کی اجازت لی۔اور پھر ڈبڈبائی آنکھوں میں آنسوؤں کو لیکر رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے دل میں حسرت اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔اس مختصر سے وقفہ میں یہاں کے درودیوار،حجر اسود،ملتزم،مقام ابراہیم، حطیم، میزاب رحمت، چاہ زمزم، صفا و مروہ، مسجد الحرام اور اس کے گرد و نواح، مکہ معظّمہ کے گلی کوچے، بازار اور بستیاں ہر چیز اس طرح ان کی نظروں میں سما گئی کہ ان کو بھلانا مشکل ہے۔عصر سے قبل گاڑیوں میں سوار ہوکر پورے قافلے والوں کے ساتھ نیلوفر ناز نحوی جدہ شریف ایئر پورٹ پر آئیں۔ساڑھے دس بجے کے ہوائی جہاز سے ممبئ پہنچی کیوں کہ کشمیر کا موسم خراب ہونے کی وجہ سے سیدھی سری نگر کی فلائٹ نہیں ملی تھی۔ممبئ سے سری نگر کی فلائٹ میں سوار ہوکر وہ اپنے وطن واپس لوٹیں۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کا یہ سفر نامہ،عشق رسول ﷺ اور ساتھ زیارت خانۂ کعبہ سے والہانہ جذبۂ احترام و عقیدت، حج بیت اللہ کے سفر سے ان کے جذبۂ اشتیاق، تقدس،شیفتگی کا احساس دلاتا ہے۔اس سفر نامہ کا ایک مستحسن پہلو یہ ہے کہ سری نگر سے قافلہ حجاج کی روانگی سے لے کر بلاد اقدس تک جملہ واقعات، مشاہدات، اور داخلی احساسات کو پورے جذبات کے ساتھ انھوں نے قلمبند کیا ہے۔

یہ سفر جس رقیق القلبی اور سوز و گداز سے طے کیا ہے،اس سے ان کی شخصیت کی پاکیزہ نفسی اور ان کی اشک باریاں، دلی دعائیں، اسلامی اخوت اور سادگی واضح ہوتی ہے۔ وفورِ جذبات میں ان کی تحریر کی روانی قدرے متاثر ہوئی ہے۔علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا

جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔اسی لیے انھوں نے دورانِ سفر اپنے مشاہدات اور معلومات کو حتی الامکان علمیت اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔انھوں نے مناسک حج اور دیگر امور کے دائرے میں اپنی علمیت کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ عازمین حج کے لیے رہنمائی کا کام کر سکتی ہے۔

اختتامیہ

اختتامیہ

''سفرنامہ'' کو اردو کی اصناف نثر میں ایک پرکشش بیانیہ صنف ادب کی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی زندگی کے لیے سفر ایک ایسی حرارت بخش غذا ہے جو اعضائے جسمانی کو تحریک اور دل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔ سفر کے وسیلے سے مسافر کی شخصیت میں ہواؤں کی پاکیزگی اور لطافت، پھولوں کا حُسن اور نزاکت، پرندوں کا حوصلہ اور بلند پروازی، پہاڑوں کی بلندی اور عظمت، سمندروں کی گہرائی اور وسعت کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ مسافر کے قلب پر فطرت اپنے راز آشکار کرتی ہے۔ سفر سے تعلقات میں اضافہ، تجربات میں وسعت اور مشاہدات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو پرکھنے اور اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے۔ عظیم شخصیات سے ملاقاتوں کا فخر حاصل ہوتا ہے نیز دنیا جہاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح سفر کرنے والے میں وسیع القلبی، کشادہ نظری، اولوالعزمی اور انکشافِ ذات کے وہ جوہر پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ سفرنامے کے مطالبات میں صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایک سیاح نے کیا کیا دیکھا اور کہاں کہاں گیا۔ اس کے اپنے تاثرات، جذبات و احساسات، اس کا عمل، ردعمل اور زاویہ نظر سفرنامے کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ سفرنامہ نگار نے اپنی بات کس ڈھنگ سے کہی ہے۔ اس کے طرز اظہار میں کس درجہ ادبیت، انفرادیت اور لطافت ہے۔

مہذب اقوام نے ساری دنیا دیکھ کر ہی اپنی تہذیب کو جلا بخشی ہے۔ گھر بیٹھے ہوئے افراد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ زندگی کی معمولی سی معمولی ضرورت کو پوا کرنے کے لیے آدمی کو گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے خواہ وہ تھوڑی دیر

اور تھوڑی دور کے لیے ہی کیوں نہ ہو اس طرح بڑے مقاصد کی تکمیل کے لیے سفر کی ضرورت اور اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم اپنی تہذیب اور اپنے تمدن یا اپنی کسی بھی قومی یا انفرادی خصوصیت کو پرکھنا چاہتے تو کسی دوسری تہذیب اور کسی دوسری خصوصیت کو سامنے رکھ کر ہی پرکھتے ہیں۔ دنیا میں کسی بھی چیز کے معیار کو جانچنے اور پرکھنے کا یہی مقبول اور معقول طریقہ ہے۔ دوسری تہذیب یا طرز معاشرت کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے لیے اس کے قریب جانا اور اس میں شریک ہونا لازمی ہے۔ اس کے قریب جانے اور قریب سے دیکھنے کے لیے سفر ہی ایک واحد ذریعہ ہے گویا اپنی اور اپنے علاوہ قومی و ملکی اصلاح کے لیے سفر ایک ناگزیر عمل ہے اسی لیے سفر کو وسیلۂ ظفر کہا گیا۔ قرآن کریم میں ''قل سیروفی الارض'' کے ذریعہ انسان کے عزم سفر کی زبردست حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اردو میں سفر نامے کا آغاز انیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ہوا۔ سفر نامہ لکھنے کی ابتدا کب ہوئی اور پہلا سفر نامہ کس نے تخلیق کیا یہ بتانا مشکل ہے مگر مغربی مورخین نے بابائے تاریخ ''ہیروڈوٹس'' کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نویس قرار دیا ہے۔ اردو سفر نامے کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلا اور نمایاں نام یوسف خان کمبل پوش کا نظر آتا ہے۔ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ ''تاریخ یوسفی'' (عجائبات فرنگ) آغاز سفر 1837، (طباعت اول 1847 مطبع العلوم دہلی کالج، باہتمام پنڈت دھرم نرائن) کو اب تک کی تحقیق کے مطابق پہلا سفر نامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو کا دوسرا قدیم سفر نامہ سید فدا حسین عرف نبی بخش کا ''تاریخ افغانستان'' 1839 تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ فدا حسین کا مقصد سیاحت نہ تھا۔ اس لیے سوائے قدامت کے اس سفر نامے کی اور کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ فدا حسین کے بعد مرزا ابو طالب خاں اصفہانی کا ''سفر فرنگ'' آغاز سفر 1856 ہندوستانی مزاج کا علمبردار ہے۔ ابو طالب اصفہانی کے بعد مولوی مسیح الدین خاں کا سفر نامہ ''تاریخ انگلستان'' 1863 میں مکمل ہوا۔ سر سید احمد خاں کا سفر نامہ ''مسافرانِ لندن'' اردو کے قدیم سفر ناموں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ یہ سر سید کا سفر نامہ ہے بلکہ مقاصد سفر اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی سفر نامے کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔ سر سید نے 1879 میں لندن کا سفر اختیار کیا تھا۔

اردو سفرناموں کو تین حصوں میں بانٹا گیا ہے یعنی انیسویں صدی کے اردو سفرنامے، بیسویں صدی کے نصف اول کے اردو سفرنامے اور دور حاضر کے اردو سفرنامے۔قدیم سفرناموں کے برخلاف بیسویں صدی کا سفرنامہ نگار صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ ردعمل کا بھی اظہار کرتا ہے۔اور نئے اسالیب میں سفر کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد اردو سفرنامہ نگاری میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔تقسیم کے اثر نے دوسری نثری اصناف کی طرح سفرنامے کو بھی متاثر کیا، خاص کر وہ سفرنامہ نگار جو تقسیم ہند کے زیر اثر منقسم ہونے کے بعد جب اپنے وطن میں مسافر بن کر آتے ہیں تو حال سے زیادہ ماضی میں سفر کرتے ہیں اور یادوں کے وسیلے سے بچپن کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے سفرنامہ نگاروں نے بھی تاریخ وجغرافیہ کے غلبے اور معلومات فراہم کرنے کے طریقہ کار اور دائرہ اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور سفرنامے کو اپنے ذاتی احساسات، تاثرات اور نظریات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ نئے سفرنامہ نگار کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں معلومات حاصل کرنے کے بے شمار ذرائع موجود ہیں اور سفرنامہ نگار، سفرنامہ کا واحد مرکزی کردار ہے سفرنامے کی تمام سرگرمیاں اسی کے وجود کا حصہ ہیں اور ہر شئے اسی کے گرد و پیش سفر کرتی ہے اس لیے سفرنامے میں تاریخ وجغرافیہ کی شمولیت غیر ضروری ہے اور سفرنامہ نگار کی ذات کو سفرنامے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ نیا سفرنامہ نگار سفرنامے کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتا ہے اور یہیں سے سفرنامے کا فن اپنے اظہار کے وسیلے سے ناول اور افسانے سے نزدیک ہو جاتا ہے۔تقسیم ہند کے بعد جن سفرنامہ نگاروں نے قاری کو متاثر کیا ہے ان میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خواجہ غلام السیدین، سید ابوالحسین علی ندوی، وزیر آغا اور گوپی چند نارنگ وغیرہ شامل ہیں۔آزادی کے بعد لکھنے والے یہ سفرنامہ نگار قدیم بھی ہیں اور جدید بھی، ان کے ہاں ادبی چاشنی، لطافت اور شگفتگی سبھی کچھ ہے مگر انھوں نے اپنے سفرناموں کو فکشن نہیں بنایا اور نہ کسی دوسری صنف کی حدوں میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ روایت سے انحراف کرنے والے افراد میں جن سفرنامہ نگاروں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ان میں محمود نظامی، اختر ریاض الدین، جمیل الدین عالی، مستنصر حسین تارڑ، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، سید وجاہت علی اور عبداللہ ملک وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان لوگوں نے اردو سفرنامے کو نئے اسالیب سے روشناس

کرایااورسفرنامے کا رخ داخل کی طرف موڑا،ان کے سفرنامے تخلیقی روش پر گامزن ہیں۔تقسیم کے بعد ہندو پاک کا سفر کرنے والوں نے حال سے زیادہ ماضی میں سفر کیا ہےان سفرنامہ نگاروں میں بلراج کومل، ہرچرن چاولہ، کیول دھیر، رام لعل، جوگندر پال، انتظار حسین، ممتاز مفتی، اور فرمان فتح پوری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فنی اعتبار سے سفرنامہ کسی مخصوص تکنیک یا کسی خاص اصول کا پابند نہیں۔سفرنامہ نگار کا مزاج اور تحریری برتاؤ ہی سفرنامہ کا اصول، اسلوب اور تکنیک ہے۔ایک اچھا تخلیق کار جب سفرنامہ لکھتا ہے تو اس کے تخلیقی تجربات سفرنامے کے لیے ایک ایسا اسلوب وضع کر لیتے ہیں جن کی سفرنامے کو ضرورت ہوتی ہے یا وہ سفرنامے کے مطالبات کو اپنے مخصوص طرز نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے گویا سفرنامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے تجربات سفر تحریر کرے مگر یہ خیال ضرور ہے کہ سفرنامے کو سفرنامہ ہی رہنے دے اسے ناول، کہانی یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔

سفرناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے جو چیزیں اور واقعات تاریخی کتابوں میں نہیں ملتے وہ سفرناموں میں مل جاتیں ہیں اور کبھی کبھی تو سفرنامے تاریخ کا ماخذ بن جاتے ہیں۔سفرنامے کسی ملک کی ایسی تصویر پیش کر دیتے ہیں جو وہاں کی تاریخی کتابوں میں نہیں ملتیں۔سفرنامے تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ سفرناموں کو علم جغرافیہ کے فروغ کا بھی ایک اہم ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ سفر کے ذریعے ہی نئے ملکوں کے موسم اور مختلف زمانوں میں اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کا علم کا پتہ چلتا ہے۔

انیسویں صدی سے قبل ہندستان میں جو سیاح آئے اور جنھوں نے یہاں کے سماجی، سیاسی، اور معاشرتی حالات تفصیل سے اپنے سفرناموں میں پیش کیے ان میں میگس تھنیز، ہیون سانگ، فاہیان اور ابن بطوطہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔انیسویں صدی کے سفرناموں کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس صدی میں دنیا نے کافی ترقی کر لی تھی۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت بڑھ رہی تھی یوروپ میں صنعتی انقلاب آ گیا تھا مزید یہ کہ یوروپی اقوام نے اپنے ملک اور اپنے براعظم سے نکل کر دوسرے ممالک کو تسخیر کرنا شروع کر دیا تھا۔

چناں چہ ہندستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا تو کچھ لوگ یوروپ کی ترقی کا حال معلوم کر کے اسے اپنی

ترقی کے لیے استعمال کرنے اور کچھ ان کی تہذیب سے مرعوب ہوکر وہاں کا سفر کرنے پر آمادہ ہوئے تو کچھ لوگوں نے مقدس مقامات کی زیارت اور اسلامی علوم وفنون سے استفادے کی غرض سے مسلم ممالک کا سفر کیا۔عصر حاضر کے سفرناموں میں مختلف خصوصیات کے باوجود کچھ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جو سفرنامے کی صداقتوں کو مجروح کرتے ہوئے اسے فکشن کے حدود میں داخل کردیتی ہیں۔ نئے سفرناموں میں کہیں کہیں مبالغہ آرائی اور اپنی ذات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا، اپنے نظریات پر بے جا اصرار کرنا جیسے عیوب پائے جاتے ہیں۔اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اظہار کے وسیلے سے اس نے اردو سفرناموں کو ایک قدم آگے ضرور بڑھایا ہے۔

اردو میں خواتین کی سفرنامہ نگاری کا جائزہ لیں تو اولیت کا سہرا نازلی رفعیہ سلطان کے سر ہے۔ نازلی رفعیہ سلطان کا سفرنامہ ''سیر یورپ'' 1908ء میں شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ سفر یورپ کے دوران ہندستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔دوسری سفرنامہ نگار خاتون بیگم سربلند جنگ بہادر کا سفرنامہ ''دنیا عورت کی نظر میں'' 1910ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مشرقی عورت یورپ کے تہذیبی مطالعے کو کس قدر اہمیت دے رہی تھی۔ اردو کی تیسری سفرنامہ نگار خاتون نے ''سفرنامہ مجاز'' قلم بند کیا اور یوں دنیا تک رسائی کے جتن میں ہماری خواتین مرد حضرات سے پیچھے دکھائی نہیں دیتیں۔تیسری سفرنامہ نگار خاتون نواب سلطان جہاں بیگم (شاہ بانو) والیہ ریاست بھوپال تھیں۔ان کا سفرنامہ ''سیاست سلطانی''، ''سفرنامہ حجاز'' 1911ء میں اشاعت پذیر ہوا یہاں اس حقیقت کی وضاحت از حد ضروری ہے کہ وسط ہند کی مشہور اسلامی ریاست بھوپال کی مسند حکومت پر یکے بعد دیگرے چار خواتین بیٹھ چکی ہیں۔جن میں نواب سلطان جہاں (ارشاد بانو) اپنی انتظامی قابلیت، تعلیم نسواں کی حمایت، تعلیم کے فروغ اور داد دہش کی وجہ سے از حد مقبول اور مشہور رہی ہیں۔ بیگم ہمایوں مرزا کا سفرنامہ ''بھوپال وآگرہ و دہلی'' 1918ء میں سامنے آیا۔ان کا اصل نام صغریٰ تھا۔یاد رہے کہ انھیں صغریٰ ہمایوں مرزا کی سرپرستی میں لاہور سے مجلّہ ''تہذیب نسواں'' کا اجرا 1898ء میں ہوا تھا۔آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھیں اور ان کا حلقۂ اثر سارے ہندستان کے متوسط اور اردو داں مسلم گھرانوں تک تھا۔

ان کا یہ سفر بھوپال آگرہ اور دہلی کی تہذیبی بہنوں سے رابطے کی ایک صورت تھی۔ 1924ء میں صغریٰ بیگم حیا کا ''سفر نامہ یورپ'' سامنے آیا اور لگ بھگ اسی زمانے میں فاطمہ بیگم ''سفر نامہ مجاز'' شائع ہوا۔لیکن خواتین کی سفر نامہ نگاری کے اولین دور میں سب سے زیادہ شہرت نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) کے حصے میں آئی۔نشاط النساء بیگم کے دو سفر نامے ''سفر نامہ عراق'' 1937ء اور سفر نامہ ''مجاز''، ''حج نامہ'' از حد مقبول ہوئے۔نشاط النساء نے اپنے خاوند مولانا حسرت موہانی کے ہمراہ 1936ء میں عراق تک کا سفر کیا تھا۔انھوں نے ''سفر نامہ عراق'' قلم بند کرتے ہوئے عراق کے طرز تمدن کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور شگفتہ طرز بیان اپنایا۔

جہاں طرز زندگی اور خیالات کے اظہار میں اور فکشن نگاری کو پروان چڑھانے میں خواتین کا اہم رول ہے وہیں اردو سفر ناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ بھی بہت اہم ہے۔

2000ء کے بعد خواتین سفر نامہ نگاروں میں لالی چودھری، اے۔امیر النساء، نیلوفر ناز نحوی قادری وغیرہ کے نام اس ضمن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لالی چودھری بطور فکشن نگار اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔لالی چودھری کے پہلے افسانوی مجموعے ''حد چاہیے سزا میں۔۔۔'' کو ادبی حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ قابل رشک ہے۔لالی چودھری نے جتنے اچھے افسانے لکھے اتنے ہی اچھے سفر نامے بھی لکھے ہیں۔وہ چار برِّ اعظموں کے کئی ممالک کا سفر کر چکی ہیں۔اب تک ان کے چار سفر نامے شائع ہو چکے ہیں ''دلی''، ''پیرس''، ''جنیوا'' اور ''اسپین''۔انھیں سیر و سیاحت اور غیر ممالک کی تاریخ جاننے کا بہت اشتیاق ہے۔ان کی دوست کے مطابق وہ تاریخ کا مذہب کی طرح مطالعہ کرتی ہیں۔لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق رکھتی ہیں۔وہ ہر ملک کی سیاحت سے قبل وہاں کی تاریخ و جغرافیہ کا ضرور مطالعہ کرتی ہیں تاکہ وہ جس ملک میں سفیر بننے جا رہی ہیں اس کے نشیب و فراز اور تہذیب و ثقافت سے پوری طرح آگہی کے ساتھ وہاں کی تواریخ کے مدنظر سیاحت کر سکیں۔

لالی چودھری نے اپنے پہلے سفر نامے ''دلّی ایک شہر آرزو'' میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی روح کشید کی

ہے۔ ہندستان اور خصوصاً پنجابیوں کی مہمان نوازی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ لالی چودھری کی بے پناہ صلاحیت کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی حافظے کی مالک ہیں اور اپنی کہانیاں لفظ لفظ زبانی سنانے پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان کی یادداشت فوٹوگرافک ہے۔

ان کا دوسرا پیرس کا سفرنامہ ''خیاباں خیاباں اِرم'' ہے جس میں انھوں نے تاریخ، ادب، تہذیب، مذہب، متھ اور حقیقت کا خوب صورت امتزاج پیش کیا ہے۔ عمارتوں کا تاریخی منظر، ان کی ثقافتی اہمیت، تعمیری لاگت، ان سے منسوب قصے، ایک ایک تفصیل فراہم کرتی ہیں۔ عمارت دیکھنے کے بعد وہ اپنا شخصی تاثر دلچسپ انداز میں تحریر کرتی ہیں۔ لالی چودھری تاریخی قصوں کو اتنا دلچسپ بنا کر پیش کرتی ہیں کہ ماضی سانس لیتا نظر آتا ہے۔ ان کی دلچسپی تاریخ اور قدیم عمارتوں سے ہے۔ نئے شہروں کی رنگینیوں سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

لالی چودھری کا تیسرا سفرنامہ ''جنیوا شہر امن یا شہر جیب تراشاں'' ہے۔ اس پورے سفرنامے میں پرس کی گمشدگی کے سسپنس کا لطف نظر آتا ہے۔ اور ان کا دعاؤں پر جو پختہ ایقان ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرس کی چوری جیسے سنگین حالات میں بھی انھوں نے ریڈ کراس تنظیم کی تاریخ، قلعہ شی یون کی اہمیت، عمودی چٹانوں کے برف پوش کہساروں، وسیع و عریض گلیشیر اور بلند آبشاروں کی خوب صورت منظر کشی کی ہے۔

لالی چودھری کا چوتھا سفرنامہ ''کاخ و کوئے طیطلہ'' ہے۔ یہ سفرنامہ اندلس کی دلچسپ تاریخ ہے جو فکشن کی حدوں میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ سفرنامہ تخلیقی نثر کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے شہر قرطبہ اور مسجد قرطبہ کی اتنی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں کہ جی عش عش کرنے لگتا ہے۔ وہ صاف گوئی سے اپنے بارے میں اظہار خیال کرتی ہیں۔ تاریخ کا اتنا تفصیلی مطالعہ، بادشاہوں اور ملکاؤں سے منسوب کہانیاں ساری جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ کسی بھی شہر کسی بھی عبارت اور کسی بھی واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھتی ہیں۔ اس کے بے شمار پہلو اجاگر کرتی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے اسپین پر لالی چودھری نے بہترین تحقیق کی ہے۔

لالی چودھری کو الفاظ پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنی عبارت کو برجستہ اشعار، پنجابی گیتوں اور قرآنی

آیات کے استعمال سے دلکش بناتی ہیں۔ وہ شہروں کی وجہ تسمیہ ہی نہیں بتاتیں بلکہ نام کا کس زبان سے تعلق ہے اور الفاظ بگڑ کر کیا روپ اختیار کر گئے۔ اس سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔ وہ انگریزی فرانسیسی الفاظ کا ترجمہ خوب صورت تراکیب کے ساتھ کرتی ہیں۔ جیسے French Cusine فرانسی طباخی، Eastern عہد نہار، Radiation فضائی کرنیں وغیرہ۔ لالی چودھری دیگر سفر نامہ نگاروں کی طرح ان کے اسلوب بیان میں بھی شگفتگی ہے۔ وہ ہر منظر کو ایسے پیش کرتی ہیں تا کہ قاری اس کو پڑھ کر قدیم تاریخ سے آشنا ہو جائے۔ ان کی زبان میں پہاڑی جھرنوں جیسا بہاؤ نظر آتا ہے۔ ان کی زبان سب سے منفرد ہے جہاں جو لفظ سجتا ہو وہ لفظ چاہے کسی بھی زبان کا کیوں نہ ہو، اسے بے ساختہ استعمال کرتی ہیں۔ انگریزی جس تیزی سے وہ بولتی ہیں اتنی ہی برجستگی سے برتتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رواں دواں اُردو کے دریا میں انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے ہوں۔ ان کی تراکیب میں جدت اور ندرت ہے جسے وہ اس خوبی سے استعمال کرتی ہیں کہ تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

اے۔ امیر النساء کا اردو زبان و ادب سے بڑا جذباتی رشتہ ہے۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جسے وہ سفر اور حضر میں کہیں فراموش نہیں کرتیں۔ اردو زبان سے ان کی ذہنی وابستگی اور قلبی لگاؤ کا اندازہ ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ تمل ناڈو کی پہلی پردہ نشیں خاتون فن کار ہیں جنھوں نے تین سفر نامے لکھے ہیں۔ جن میں پہلا ''سفر نامہ حجاز'' دوسرا ''ارض مقدس میں چند روز'' جو بیت اللہ سے متعلق عقیدت کے اظہار اور دینی و تاریخی معلومات کی بہترین مثال ہیں۔ تیسرا سفر نامہ ''سرحد کے اس پار'' ہے۔ علاوہ ازیں ان سفر ناموں کے ذریعے انھوں نے سعودی عرب اور مغربی ایشاء کے اتنے ملکوں کی سیر کرائی ہے کہ قاری گھر بیٹھے تقریباً آدھی مہذب دنیا سے واقف ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف نے اس مقالے میں ان کے ایک سفر نامہ ''سرحد کے اس پار'' کی تفصیل پیش کی ہے۔ اے۔ امیر النساء کا یہ سفر نامہ پاکستان کے صرف دو شہر لاہور اور کراچی کی سیاحت کی یادگار ہے۔

وہ سارے نظائر بنظر عمیق اے۔ امیر النساء نے اپنے سفر نامے میں تحریر کیے ہیں۔ جو انھوں نے بچشم عمیق مطالعہ سفر نامہ ''سرحد کے اُس پار'' یعنی پاکستان کے شہر کراچی اور بہشت نما لاہور میں کیا ہے۔ ان کے اس سفر نامے

میں ہم کو پاکستان کی معاشرت ہی کی جھلکیاں نظر نہیں آتی بلکہ موجودہ پاکستان کے سیاسی وانتظامی حالات اور نظم وضبط کی صورت حال اور عسکریت پسند سرگرمیوں کے بھی نظارے ملتے ہیں۔ انھوں نے بڑی خوصورتی سے دہشت اور امن کی بدلتی صورتوں کا جائزہ لیا ہے کہ کس طرح جشن وجلوس کی مسرتوں میں اچانک بم دھماکوں سے دہشت ورنج و الم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ بدلتے موسم کی طرح امن وامان کی صورت حال بھی پاکستان میں بدلتی رہتی ہے۔ جہاں پاکستان کی خوب صورتی، قدرتی مناظر، تاریخی عمارات، اسلامی آثار وتمدن اور جمعیت سے امیر النساء نے خوش گوار اثر قبول کیا ہے۔ وہیں جرائم کی کثرت، رشوت ستانی، بدنظمی، جہالت، افلاس اور عوام کے غیر اسلامی طرز عمل کے لیے وہ شاکی بھی ہیں۔ ان کے لہجے کی شیرینی میں اچانک تلخی آنے لگتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کھری کھری سنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ حقیقت پسندی سفرنامے کی جان ہے اور حقیقت پسندی ہی سفرنامے کی صنف کی معراج ہوتی ہے۔

اے۔ امیر النساء کی تحریر میں سادگی، سچائی، بے ساختگی ایک طاقت بن کر ابھرتی ہے اور قاری کو زیر کر لیتی ہے۔ ان کی تحریر کا لب ولہجہ نرم رودریا کے مانند ہے مگر قلم میں اتنی بے باکی ہے کہ وہ سچ بات کہنے سے کہیں گریز نہیں کرتیں۔ انھوں نے جہاں کوئی ایسی چیز دیکھی یا کوئی ایسی بات سنی جو ان کی طبیعت سے مناسبت اور مزاجِ اسلامی سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو اس پر ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے سفرنامے میں انگریزی الفاظ کو خوب مشاقی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اس سفرنامہ میں نظر آتی ہے وہ اس کے روزنامچہ والا انداز ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو امیر النساء نے اس صنف میں کیا ہے۔ جس طرح روزنامچہ میں حال کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جا بجا حال کے صیغے میں بات کی گئی ہے۔ جس سے بیان میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور سفرنامہ اس طرح لکھا گیا ہے۔ جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتا ہے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اس سفرنامے میں ان کا تنقیدی شعور عروج پر نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا عام سفرناموں کے علاوہ اس مقالے میں حج کے تعلق سے سفرنامہ ''شہر ہائے نور'' ڈاکٹر نیلوفر ناز

نحوی کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ حج کے سفرنامے اپنے مقاصد کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوتے ہیں یہ سفرنامے عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ میں سرشار ہونے کی وجہ سے عقیدت مندانہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ موضوع کی طرح ان کے اسالیب بیان میں بھی جذبات عقیدت کی فراوانی، احساس ندامت کا روحانی سکون، رِقّت وانبساط کی امتزاجی کیفیت انھیں عام سفرناموں سے مختلف کر دیتی ہے۔

سفرنامۂ حج ڈاکٹر نیلوفر ناز کی دیرینہ خواہشوں کا مرہونِ منّت ہے۔ حج کی سعادت ان کو 2004 میں نصیب ہوئی اور یہ سفرنامہ انھوں نے اپنی اس پاکیزہ سیاحت کے بارے میں قلمبند کیا۔ فکشن میں خصوصی شہرت ومقبولیت کی حامل ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اس سفرنامہ میں بھی زبان و بیان اور ندرت بیان کی شگفتگی کو بڑے ہی خوب صورت انداز میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آئی ہیں۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کا یہ سفرنامہ، عشق رسول ﷺ اور ساتھ زیارت خانۂ کعبہ سے والہانہ جذبۂ احترام و عقیدت، حج بیت اللہ کے سفر سے ان کے جذبۂ اشتیاق، تقدس، شیفتگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس سفرنامہ کا ایک مستحسن پہلو یہ ہے کہ سری نگر سے قافلہ حجاج کی روانگی سے لے کر بلاد اقدس تک جملہ واقعات، مشاہدات، اور داخلی احساسات کو پورے جذبات کے ساتھ انھوں نے قلمبند کیا ہے۔

یہ سفر جس رقیق القلبی اور سوز و گداز سے طے کیا ہے، اس سے ان کی شخصیت کی پاکیزہ نفسی اور ان کی اشک باریاں، دلی دعائیں، اسلامی اخوت اور سادگی واضح ہوتی ہے۔ وفورِ جذبات میں ان کی تحریر کی روانی قدرے متاثر ہوئی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسی لیے انھوں نے دوران سفر اپنے مشاہدات اور معلومات کو حتی الامکان علمیت اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے مناسک حج اور دیگر امور کے دائرے میں اپنی علمیت کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ عازمین حج کے لیے رہنمائی کا کام کر سکتی ہے۔

کتابیات

نام مصنف	نام کتاب	مطبع	سنہ اشاعت
انور سدید، ڈاکٹر	اردو ادب میں سفرنامہ	لاہور	1989
اے۔امیر النساء	سفرنامہ سرحد کے اس پار	سرمدی پبلیکیشنز، چینئی	2007
تنویر احمد علوی، ڈاکٹر	اصول تحقیق و ترتیب متن	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2009
حسن مثنیٰ	مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری	نیو لائن پروسس، دہلی	2003
خالد محمود	اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2011
خواجہ حسن نظامی	سفرنامۂ افغانستان	دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی	1933
خلیق انجم، ڈاکٹر	متنی تنقید	اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2006
رفیعہ سلیم، ڈاکٹر	لالی چودھری کے سفرنامے	جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2016
سرسید احمد خاں	مسافران لندن	مجلس ترقی ادب، لاہور	1961
شبلی نعمانی، مولانا	سفرنامۂ روم ومصر وشام	قومی پریس، دہلی	1894
شاہ بانو	سیاحت سلطانی	مفید عام پریس، آگرہ	1915
صغریٰ بیگم حیا	سفرنامۂ یورپ	حیدرآباد، دکن	1936
عبدالرزاق قریشی	مبادیات تحقیق	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی	2014
عبدالماجد دریابادی، مولانا	سفر حجاز	معارف پریس، اعظم گڑھ	1931

عابد حسین، ڈاکٹر	رہ نور شوق	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1979
قرۃ العین حیدر	جہانِ دیگر	مکتبہ اردو ادب، لاہور	1970
قدسیہ قریشی، ڈاکٹر	اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں	لکھنؤ	1987
گوپی چند نارنگ	سفر آشنا	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی	1982
گیان چند جین، ڈاکٹر	تحقیق کا فن	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2005
محمد حسین آزاد	سیر ایران	کریمی پریس، لاہور	1886
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ	اورینٹ پبلشر، لاہور	2014
نیلوفر ناز نحوی قادری، ڈاکٹر	شہر ہائے نور	قادری پبلیکیشنز، سری نگر	2010
نازلی رفعیہ بیگم	سیر یورپ	یونین پریس، لاہور	1908
نشاط النساء بیگم	سفرنامۂ عراق	دہلی	1937
نشاط النساء بیگم	سفرنامۂ حجاز	دہلی	1937
نواب کریم خاں	سیاحت نامہ مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارہ تنقیدی ادب، لاہور	1980
وزیر آغا	بیس دن انگلستان میں	ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا	1987
یوسف کمبل پوش مرتبہ تحسین فراقی	عجائبات فرنگ	لاہور	1984